تمثیلِ نو ایک معتبر جریدہ

۹۸۰ + ۵۶ + ۳۱ + ۱۲

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

ماہنامہ ''تمثیل نو'' دربھنگہ

جلد: ۵	اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء	شمارہ: ۱۹

زرِ تعاون

فی شمارہ: ۲۰ روپے، سالانہ: ۱۰۰ روپے، خصوصی تعاون: ۳۰۰ روپے، تاحیات (بھارت): ۳۰۰۰ روپے

پاکستان و بنگلہ دیش (سالانہ): ۲۰۰ روپے، دیگر ممالک (سالانہ): ۱۵ امریکی ڈالر / پونڈ

رابطہ: ''تمثیل نو''، قلعہ گھاٹ، دربھنگا ۴، موبائل: 9431085816 فون: 06272-258755

email-imamazam@epatra.com

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر و آنر ڈاکٹر امام اعظم نے ایم۔ آر آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی ۔۲ سے چھپوا کر دفتر ''تمثیل نو'' اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگا ۴ سے شائع کیا۔

اقرا گرافکس، پانی ٹنکی، لال باغ، دربھنگہ (موبائل: 9334911467)

ترتیب

مجھے کچھ کہنا ہے......

''تمثیل نو'' کا گذشتہ شمارہ ۱۷، ۱۸ (مشترکہ) اپریل تا ستمبر ۰۵ء اردو ادب کے رجحان ساز شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور مظہر امام کی نذر تھا جس کی پذیرائی ادبی حلقے میں ہنوز ہو رہی ہے۔

زیر نظر شمارہ ۱۹ پروفیسر وہاب اشرفی کے ایک لاثانی کارنامے کے حوالے سے پیش خدمت ہے۔
وہاب اشرفی کے بارے میں تین باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی دانشور انکار نہیں کر سکتا۔ اوّل وہ ایسے نقاد ہیں جو محض دلائل اور مثالوں سے اپنی باتوں کو تسلیم کروانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی ٹھوس بنیادوں کو بھی بروئے کار لاتے ہیں جس سے اُن کی آرا خود بخود Establish ہونے لگتی ہے۔ دوم وہاب اشرفی محض سرسری جائزہ لینے کے عادی نہیں ہیں۔ جارحانہ اور منفی رویوں کو رد کرتے وقت اس بات کا خصوصی دھیان رکھتے ہیں کہ مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کسی طرح پس پردہ نہ رہ جائے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کے ادبی کارناموں کو وہ سرمایہ سمجھتے ہیں اسی لئے حوالہ دیتے وقت اُن کی نظر بہ یک وقت تینوں زمانے کے عکس لئے ہوئے نظر آتی ہے۔

'تاریخ ادبیاتِ عالم' اُن کا تاریخ ساز کارنامہ ہے جو ۷ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کام کافی یکسوئی سے انہوں نے کیا ہے۔ تنہا اتنا بڑا پروجکٹ مکمل کرنا کافی دشوار تھا۔ انہیں کہیں نہ کہیں احساس ہوا کہ اردو ادب عالمی ادب کی آشنائی کے بغیر ٹھوس بنیادوں پر اپنا تخلیقی سفر تازگی کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتا۔ اسی تلاش و جستجو کے مراحل سے گذرتے ہوئے وہاب اشرفی نے پتہ نہیں عمر کے کتنے حصوں میں کتنی بار غور و خوض کیا ہوگا اور یہ پروجکٹ دھیرے دھیرے جب اُن کے ذہن میں مکمل ہونے کی صورت تک پہنچ گیا تو انہوں نے ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' جیسا بڑا تاریخی کارنامہ انجام دے دیا۔ اس پروجکٹ کو ایک تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے یا تاریخ برائے تاریخ کے طور پر نہیں دیکھنا چاہئے کیوں کہ جستہ جستہ اُردو ادب میں فوک لٹریچر ہندوستان کی کلاسیکی ادبیات سنسکرت میں موجود ہیں، پالی کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ہندی، بنگلہ، گرگمھی، تامل، تیلگو اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں وہ منظر عام پر آتے رہے ہیں۔ اُن زبانوں کا ادب بھی، ادبی کارنامے بھی جن کا رشتہ اُردو سے گہرا رہا ہے جیسے عربی، فارسی، ترکی وغیرہ بھی گاہے بہ گاہے اور جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انگریزی، جرمن، فرنچ، جرمن کے ادبی کارنامے بھی ترجمہ ہو کر رسالوں کے ذریعہ قاری تک پہنچتے رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں روسی اور چینی ادب بھی اُردو کے قارئین تک پہنچتے رہے ہیں لیکن سلسلہ وار، بالترتیب کوئی ایسا کارنامہ کسی شخص نے آج تک پیش نہیں کیا جس طرح وہاب اشرفی نے انجام دیا ہے۔

تاریخ کو برائے تاریخ اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے وہاب اشرفی کے کارنامے کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش درست نہیں ہے کیوں کہ وہاب اشرفی نے دنیا کے تمام ادب کو ایک جگہ جمع کرنے کا جو کارنامہ انجام دیا ہے اُس میں یہ بات زیر غور رہنی چاہئے کہ انسانوں کی بنائی ہوئی سرحدیں انسانی جذبات اور

اس کی جہتوں کی نفی نہیں کرسکتیں۔ جغرافیائی حدود تاریخی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، نسلی، فکری صورت حال ہر ملک کے الگ ہو سکتے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ انسان جس ساخت کا بنا ہوا ہے اُس کے اندر محض میکانکی عمل ہی جاری رہتا ہو۔ کوئی بھی پابندی اور سماجی قدریں اُس کے ذہن کو غلامی کی زنجیریں نہیں پہنا سکتیں۔ اس لئے اُس کے اندر جو کچھ ٹوٹتا اور بکھرتا ہے، جو کچھ اس پر گذرتا ہے، جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اور جس ہیجان و کرب سے وہ دوچار ہوتا ہے اُس کا اظہار اپنے انداز میں کرتا رہتا ہے اس کا اندازہ وہاب اشرفی کی اس مثبت کوشش سے ہوتا ہے جو ایک تاریخ ساز کارنامہ ہی نہیں بلکہ تمام سرحدوں کو توڑتا ہوا پھیلتا ہوا ایک وسیع دائرہ کار ہے اس پروجیکٹ کے ذریعہ نہ صرف تخلیق کاروں کو سوچنے کی دعوت ملتی ہے بلکہ تنقید نگاروں کو بھی اپنے پیمانے پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک ایسا پروجیکٹ ہے جس کی مثال اب تک اُردو میں موجود نہیں!

ادبی وثقافتی خبریں:

● بھارت رتن اور صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام ۵راگست ۰۵ء کو شام کے تقریباً ۵ بجے شلپا کلاویدیکا (ہائی ٹیک سٹی) آڈیٹوریم میں آزاد ہندوستان کی پہلی قومی اُردو یونیورسٹی ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'' کے پہلے کانوکیشن سے خطاب کرتے ہوئے اردو زبان کو سائنسی پیراہن دینے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا تا کہ اسے اصل دھارے سے جوڑا جا سکے اور صنعتی جستجو کا جذبہ پیدا کرنے اور اردو میں تعلیم کو روزگار سے جوڑنے میں مدد مل سکے۔ اردو کو علوم اور سماج سے جوڑنے کی بھاری ذمہ داری اس یونیورسٹی پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے اس یونیورسٹی کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر زیادہ زور دینے کی بات کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی شناخت، ادب اور شاعری تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اُسے اس سطح سے بلند کر کے دیگر شعبوں تک وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ یہ یونیورسٹی جہاں اردو کے فروغ وترویج کا کام کر رہی ہے وہیں روایتی اور فاصلاتی طرز تعلیم کے ذریعہ اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ فنی تعلیم بھی فراہم کر رہی ہے۔ یہ تعلیمی پروگرام خواتین کی شرکت کو بڑھائے گا اور نتیجتاً خواتین خواندگی میں اضافہ ہوگا۔ صدر جمہوریہ نے ٹیلی ویژن اور ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعہ اُن تمام افراد تک رسائی حاصل کرنے کی صلاح دی جواب تک علم سے محروم ہیں۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر راج بہادر گوڑ (صدر انجمن ترقی ہند) اور سید حامد (چانسلر ہمدرد یونیورسٹی) کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی نیز بی اے، بی کام اور بی ایس سی کی ڈگریاں بھی تقسیم کی گئیں اور گولڈ میڈلس بھی دئے گئے۔ یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر عبید صدیقی نے اس کانوکیشن کی صدارت کی اور وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس موقعہ پر جھارکھنڈ کے گورنر جناب سید سبط رضی بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ اس موقعہ سے یونیورسٹی ہذا کے سابق وائس چانسلر پروفیسر ایم شمیم جے راجپوری، رجسٹرار جناب فاروق احمد، ڈائرکٹر فاصلاتی تعلیم پروفیسر کے آر اقبال احمد، ایف اوو ائی جینت راؤ، ڈاکٹر عباس خاں، ڈاکٹر ابوالکلام، اسسٹنٹ ڈائرکٹر فاصلاتی ڈاکٹر شہید خاں، کنٹرولر آف اگزام پروفیسر وہاب قیصر، پروفیسر خالد سعید ڈاکٹر محترمہ نکہت جہاں، ڈاکٹر ایس اے واجد، ڈاکٹر محمد ظفرالدین، محمد جمال الدین خاں،

ڈاکٹر شجاعت علی راشد، اراکین اکزیکیٹو کاؤنسل، یونیورسٹی کے تدریسی وغیر تدریسی رفقائے کار کے علاوہ تمام ریجنل سنٹرز کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شاہد پرویز دہلی، ڈاکٹر امام اعظم دربھنگہ، ڈاکٹر محمد احسن بھوپال، ڈاکٹر عید محمد انصاری پٹنہ، ڈاکٹر قاضی ضیاءاللہ بنگلور، ڈاکٹر این آئی ملا ممبئی، عبدالغنی سرینگر، اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر عمران احمد دربھنگہ، اسسٹنٹ رجسٹرار شری راٹھور دہلی وغیرہ سمیت معزز مہمان سابق ایم پی جناب عزیز قریشی و دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔

● ہندوستان میں اردو کے حق میں حالات اب اتنے سنگین نہیں رہے جتنے ۲۰۔۲۵ برس پہلے تھے۔ اردو اور ہندی کی آمیزش سے جس ہندوستانی زبان کو سامنے لانے کی سیاسی کوششیں ناکام رہیں، وہ زبان بالی ووڈ کی ثقافت اور گلوبلائزیشن کے نتیجے میں سامنے آرہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار انتہائی تذکرے میں رہنے والے فروغ اردو کی سفارشات کے مرتب سابق وزیر اعظم ہند اندر کمار گجرال اور شاعر گلزار نے ممتاز اردو نقاد و دانشور پروفیسر گوپی چاند نارنگ کی تازہ ہندی کتاب ''اردو پر کھلتا دریچہ'' کی تقریب رونمائی میں کیا۔ اس موقعہ پر ہندی، اردو، انگریزی کے ممتاز ادباء و شعراء موجود تھے۔ مسٹر گجرال نے اردو پر کھلتا دریچہ، کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کی جستجو پسندانہ طبیعت کا آئینہ قرار دیا۔ گلزار نے اردو ہندی لہجے کے ملاپ سے پیدا ہونے والی تبدیلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے زیر بحث کتاب کو افسانوں اور شاعری کے بعد تنقید کی سطح پر اردو اور ہندی میں قربت پیدا کرنے کا مستحسن قدم بتایا۔ اردو تنقید کی یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے جو ہندی میں شائع ہوئی ہے۔ ممتاز ہندی ادیب ہریش ترویدی نے کہا کہ ہم ہندی والوں کے لئے پروفیسر نارنگ نے اردو کا ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ پروفیسر منیجر پانڈے نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی یہ کتاب اردو کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیوں کو بھی دور کرے گی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے کہا کہ بحیثیت ناقد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کبھی کسی تحریک یا دبستان کی ذہنی غلامی قبول نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ یہ ان کے یہاں فیض جیسا شاعر بھی اپنی اسٹیریو ٹائپ پہچان سے الگ نظر آتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پروفیسر نارنگ کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ۵۰ سالہ ادبی سفر میں کہیں رکے نہیں۔ تنقید و دانشوری کے میدان میں ان کا Contribution بے مثال ہے۔ ترقی پسند ادیب کملیشور نے کہا کہ ڈاکٹر نارنگ کی کتاب ان کے نزدیک نہ صرف اردو پر بلکہ ملی جلی ہندوستانی تہذیب پر کھلتا دریچہ ہے۔ پروفیسر نرملا جین نے ادب میں پروفیسر نارنگ کی اس رہنمائی کی ستائش کی کہ ''کیا چیز کیسے نہ پڑھی جائے۔ پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ پروفیسر نارنگ ان لوگوں میں ہیں جو اردو کے کاروان کو مہمیز لگانے میں پیش پیش ہیں۔ آخر میں پروفیسر نارنگ نے کہا کہ اردو ہندی کی کشمکش دراصل نفرت کی سیاست کا حصہ ہے اور ان کی زندگی کا مشن اس نفرت کی سیاست کے خلاف ٹرنا ہے۔ آج جنوبی ایشیا کی تقریباً ۷۰ کروڑ آبادی اردو اور ہندی بولتی ہے۔ زبانوں کے رشتوں کو کمیونلائز کرنے کی مساعی ہمیشہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے کہا کہ ادیب کا فرض نامساعد حالات میں ہمت نہ ہارنا اور اپنا کام کئے جانا ہے۔ میں نے اس کتاب کے ذریعہ نفرت کی سیاہ خلیج کے کنارے روشنی کا ایک ننھا سا چراغ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔

● ہیوسٹن (امریکہ) میں معروف پاکستانی شاعر ریورنڈ ڈاکٹر افضال فردوس چیئرمین محمد میاں

سومرو کی دعوت پر گذشتہ دنوں پاکستان گئے۔ وہاں موصوف نے مختلف ٹیوی چینلوں، ریڈیو اور اخبارات کو انٹرویو دئے۔ قائداعظم یونیورسٹی کے شعبہ پاکستانی زبانوں کے چیئر مین ڈاکٹر انعام الحق نے ان کے اعزاز میں اسلام آباد میں ایک باوقار تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں حکومت پاکستان کے اعلیٰ افسران اور اسلام آباد کے ادیبوں اود شاعروں نے شرکت کی۔ جناب غلام سرور خاں، وزیر برائے محنت وافرادی قوت اور سینئر پاکستانیز کی طرف سے ڈاکٹر افضال فردوس کو Best Poet ایوارڈ دیا گیا نیز سکریٹری ایجوکیشن نے استقبالیہ پیش کیا۔ پاکستان ٹی وی کے پی آر او اصغر عابد نے نظامت کے فرائض انجام دئے۔ اسی تقریب میں موصوف کے تازہ شعری مجموعہ ''شالوم'' کا اجراء عمل میں آیا۔

● اردو قبیلہ جمشید پور کے زیر اہتمام 'ایک شام ڈاکٹر منظر کاظمی کے نام' کا انعقاد کریم سٹی کالج ہال میں ہوا۔ سال رواں کا ''ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ'' عروس البلاد، ممبئی کے معروف افسانہ نگار اور سہ ماہی تکمیل کے مدیر جناب مظہر سلیم کو پیش کیا گیا۔ اس موقعہ پر ٹیلکو کے سابق ڈپٹی جنرل منیجر اور مہمان خصوصی عزیز حسین، مہمان اعزازی جناب ایس این پانڈے، پروفیسر یحیٰی، ڈاکٹر افسر کاظمی نے جناب منظر کاظمی مرحوم کی گونا گوں خوبیوں پر روشنی ڈالی۔ اپنے صدارتی خطبہ میں معروف شاعر جناب سید احمد شمیم نے مرحوم منظر کاظمی کو ذہین فنکار قرار دیا۔ منظر کاظمی ایوارڈ سے سرفراز ہونے والے نوجوان افسانہ نگار مظہر سلیم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ منظر کاظمی کا افسانوی مجموعہ لکشمن ریکھا مجھے مرزا غالب کے دیوان کے ہم پلّہ نظر آتا ہے۔ تقریب کی نظامت محترمہ نیہا تیواری نے انجام دی۔ جناب منظر کلیم نے تمام حاضرین اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

● ظفر محبی کی تازہ کتاب ''گلہائے چمپا'' کی رسم اجرا کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ یہ ایک دستاویزی کتاب ہے جس کی اہمیت آج سے پچاس ساٹھ سال بعد سمجھی جائیگی۔ ممتاز محقق ڈاکٹر خلیق انجم نے ایسے تذکروں کو روایتی ادبی سرمائے میں جوڑ کر دیکھنے کی وکالت کی۔ پاکستان سے آئے ممتاز محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے ظفر محبی کی کاوش کو سراہا۔ مہمان خصوصی علیگڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شمشاد حسین نے ادیبوں کے مزاج اور شخصیت کی نفسیاتی مطالعہ پر زور دیا۔ معروف افسانہ نگار شفیع جاوید چمپارن کے ادیبوں اور شاعروں سے اپنی قربت کا بڑے دل پذیر انداز میں ذکر کیا۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کی۔ مشتاق احمد نوری، ڈاکٹر منظر اعجاز، نسیم احمد نسیم، واحد نظیر اور ترنم جہاں نے مقالات پیش کئے۔

● ششی ٹنڈن کے مطابق گذشتہ دنوں چنئی (سابق مدراس) کے معروف وفعال اشاعتی وادبی ادارہ تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز کے زیر اہتمام جناب مختار بدری کی مرتبہ ''تمل اردو'' اور ''اردو تمل'' لغات کی رسم اجرا منعقد ہوئی۔

● شہر کڈپہ کے نئے لہجے کے شاعر وادیب عقیل جامد (مدیر تحصیلدار، کڈپہ) کے شعری مجموعہ ''گل دیگر شگفت'' کی رسم اجرا ڈاکٹر اسماعیل بیابانی میموریل لائبریری، میلاد گھر، کڈپہ شریف میں انجام پذیر ہوئی۔ اس جلسہ کی صدارت الحاج رشید احمد نے کی اور تمل ناڈو کے مشہور شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور صحافی (مدیر اعلیٰ

نور جنوب، چنئی) علیم صبا نویدی بطور مہمان اعزازی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ رسم اجراء الحاج محمد احمد اللہ (رکن اسمبلی، حکومت آندھرا پردیش) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس رسم اجرا کے بعد جناب عقیل جامد کی گل پوشی کے ساتھ ساتھ عقیل جامد کے فن اور شخصیت پر جناب علیم صبا نویدی، ڈاکٹر راہی فدائی، ساغر جیدی اور یوسف حنفی نے مقالے پیش کئے۔ اس جلسہ کے بعد ایک مشاعرہ کا اہتمام ہوا۔

● سرکاری حکم نامے کے مطابق ڈاکٹر ابرار رحمانی کا تبادلہ دوردرشن نیوز میں کردیا گیا ہے۔ خط و کتابت کے خواہش مند حضرات اس پتہ پر رابطہ قائم کریں۔ تزئین اپارٹمنٹ ۲۲/۹/۱۷، ذاکر نگر، نئی دہلی۔ ۲۵

● مقامی ملت کالج دربھنگہ میں ادبی دالان کے زیر اہتمام ایک سیمینار بعنوان ''وہاب اشرفی بحیثیت نقاد اور محقق'' کا انعقاد ہوا۔ اس موقعہ پر ڈاکٹر منصور عمر اور فیاض احمد وجیہہ نے ان کی تصنیف ''مابعد جدیدیت: مضمرات و ممکنات'' کا تجزیاتی مطالعہ، ڈاکٹر امام اعظم نے ''وہاب اشرفی کی تنقیدی انفرادیت''، جمال اویسی نے وہاب اشرفی کی تصنیف ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' کا جائزہ پیش کیا۔ پروفیسر ہمایوں جمیل، ڈاکٹر افسر کاظمی اور ڈاکٹر مجیر احمد آزاد کے مقالے کی تلخیص ان کی غیر موجودگی میں پیش کی گئی۔ ایل این متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر رئیس انور اس تقریب میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور وہاب اشرفی پر خوبصورت گفتگو کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر شاکر خلیق نے وہاب صاحب کے ادبی کارناموں پر بھرپور روشنی ڈالی۔ ملت کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر اے اے ہلال نے بھی اظہار خیال کیا۔ سیمینار کے صدر بزرگ شاعر جناب حسن امام درد نے اپنا مقالہ بعنوان ''وہاب اشرفی: دوست، نقاد اور محقق'' پیش کیا۔ انجمن کے صدر خالد حسین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

● ایل این متھلا یونیورسٹی کے پی جی شعبۂ اُردو میں بہار اردو اکیڈمی کے اشتراک سے ایک سیمینار بعنوان ''متھلا میں اردو زبان و ادب کا ارتقا'' کا انعقاد ہوا جس کا افتتاح کرتے ہوئے یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر راج منی پرساد سنہا نے کہا کہ پورے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان کی ترقی و ترویج میں انٹرنیٹ کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر نیلامبر چودھری (ایم ایل سی) نے جلسہ کی صدارت کی۔ پروگرام کے نگراں صدر شعبۂ اُردو پروفیسر محمد طیب صدیقی تھے۔ بہار اردو اکیڈمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر عبدالواحد انصاری نے کہا کہ اگر میتھلی قدیم زبان ہے تو دوسری قدیم زبان اردو ہے۔ سیمینار کے دوسرے سیشن میں پروفیسر طیب صدیقی نے متھلا میں اردو شاعری ۸۰ء تک، مشتاق احمد نوری نے متھلا کی افسانوی کائنات، پروفیسر رئیس انور نے تحقیقی مطبوعہ مقالے متھلا میں، ڈاکٹر فاران شکوہ یزدانی متھلا یونیورسٹی میں سند یافتہ غیر مطبوعہ مقالے، ڈاکٹر ارشد جمیل ''متھلا کے غیر مطبوعہ مقالوں کا تفصیلی جائزہ'' سی ایم کالج کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر منصور عمر ''متھلا میں اردو شاعری کا ارتقاء ۸۰ تا حال''، مولانا آزاد یونیورسٹی کے ریجنل ڈائرکٹر دربھنگہ ڈاکٹر امام اعظم نے ''متھلا میں اردو صحافت'' ڈاکٹر محمد قیس صدر شعبۂ اردو سی ایم کالج نے ''متھلا یونیورسٹی میں اُردو درس و تدریس کے مسائل اور ان کے حل کے اقدامات: دستاویزی حوالے سے'' اور

ڈاکٹر عبدالقیوم ساقی نے ''یونیورسٹی کا ترانہ'' پیش کیا۔ نیز ان کے مقالہ کا عنوان ''متھلا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے قیام کی تاریخ'' تھا۔ اخیر میں ڈاکٹر عبدالواحد نے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

وفیات:

● اردو کے معروف طنز و مزاح شاعر اور صحافی ڈاکٹر نظر برنی کا انتقال ۲۳ر جنوری ۰۵ء کو صبح ۶ بجے مکہ مکرمہ میں ہوگیا۔ ان کی تدفین جنت المعالیٰ قبرستان میں ہوئی۔ موصوف فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے ۱۳ر جنوری کو اپنی اہلیہ کے ساتھ سعودی عرب گئے وہیں انہیں نمونیا کی شکایت ہوئی۔ اسپتال میں بھرتی کئے گئے۔ مرحوم ۷ر نومبر ۱۹۴۱ء کو بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ وہ مشہور شاعر خضر برنی کے صاحبزادہ تھے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈپٹی لائبریرین کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ مگدھ یونیورسٹی (بہار) سے مولانا محمد علی جوہر پر انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مزاحیہ شاعری کے مجموعے گستاخی معاف، چچے، کفگیر اور گورکھ دھندا منظر عام پر آچکے ہیں۔ ایک پندرہ روزہ اخبار ''لہریں'' بھی ان کی ادارت میں شائع ہو رہا تھا۔

● اردو کے مشہور افسانہ نگار اور صحافی شبیر احمد کا انتقال ۳ر جون ۰۵ء کو پٹنہ میں ہوگیا۔ موصوف ۳۰ر مارچ ۱۹۳۸ء کو دربھنگہ کے ایک قصبہ اسلام پور پڑی میں پیدا ہوئے۔ ان کا بنیادی پیشہ درس و تدریس تھا جہاں سے چند سال قبل سبکدوش ہوئے تھے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''اعتراف'' اور ''ہو بہو'' منظر عام پر آچکے ہیں۔ انجمن ترقی اُردو بہار کے علاوہ روزنامہ ''صدائے عام'' پٹنہ سے بھی وابستہ رہے۔

● معروف شاعر، ادیب اور سیاسی مفکر عبدالواحد خاں مائل ملیح آبادی کا ۱۹ر جون ۰۵ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۸ سال تھی۔ انہوں نے تقریباً ۲۰۰ تاریخی اسلامی ناول لکھے۔ جن میں نیا آدمی، کعبہ سے کربلا تک، مرگِ یزید، سکھ، ادھوری بات کی کافی پذیرائی ہوئی۔ ایک شعری مجموعہ 'لازوال' اور 'سیرت پاک' پر غیر مطبوعہ کلام 'محمد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم' قابل ذکر ہیں۔ مرحوم پوری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ وہ خاکسار تحریک الہند کے قائد بھی رہے۔

● مہاراشٹر کے سابق وزیر ماہر تعلیم اور ممتاز اسکالر ڈاکٹر رفیق زکریا کا حرکت قلب بند ہوجانے سے ۹ر جولائی ۰۵ء کو ممبئی میں انتقال ہوگیا۔ موصوف ریاست مہاراشٹر کے ضلع تھانے کے سوپارا میں ۵ر اپریل ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ملک میں صحافتی علمی، تحقیقی، تاریخی اور سیاسی شخصیت کے طور پر معروف تھے۔ وہ مہاراشٹر میں ۱۵ برسوں تک وزیر رہے، کانگریس میں مختلف تنظیمی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی نبھایا اور ۱۹۷۸ء میں راجیہ سبھا میں ڈپٹی لیڈر کے فرائض بھی انجام دئے۔ مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زائد علمی تحقیقی کتابیں مختلف موضوعات پر لکھیں۔ جن میں 'محمد اور قرآن' کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ مرحوم کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔ ان کے تیسرے لڑکے فرید زکریا معروف امریکی ہفت وار ''نیوز ویک'' کے مدیر ہیں اور اہلیہ محترمہ فاطمہ زکریہ صحافت سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر زکریا نے تقریباً ۱۵ کالج قائم کئے جنہیں سابق صدر جمہوریہ آر وینکٹ رمن نھنی یونیورسٹی کہا کرتے تھے۔

● دانشور، ماہر تعلیم، ادیب اور افسانہ نگار پروفیسر قمرالتوحید کا انتقال ۲۲ر جولائی ۰۵ء کو بھاگلپور میں ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۷ سال تھی۔ موصوف بھاگلپور یونیورسٹی میں صدر شعبۂ انگریزی تھے۔ ان کے متعدد مضامین انگریزی میں شائع ہوئے ہیں۔ اردو ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انہوں نے اردو میں کہانیوں کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ مکڑا شائع ہو چکا ہے۔ ایل این متھلا اور بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔ مشہور افسانہ نگار پروفیسر شمیم افزا قمر ان کی اہلیہ ہیں جو بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے ۹۹ء میں سبکدوش ہوئی ہیں۔

● خادم حرمین شریفین شاہ فہد کا یکم اگست ۰۵ء کو انتقال ہوگیا۔ وہ ایک عرصہ سے صاحب فراش تھے۔ موصوف ۱۹۸۲ء میں سعودی عرب کے بادشاہ بنائے گئے تھے۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز عصر دارالحکومت ریاض کی جامع مسجد امام ترکی بن عبداللہ میں ادا کی گئی۔ ان کی موت سے مسلم ممالک میں سوگ کا ماحول قائم ہوگیا نیز پاکستان نے ۷ دنوں کے قومی سوگ کا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں پیدا ہونے والے شاہ فہد نے ۲۳ سال تک حکومت کی۔ ان کے زمانے میں ۳ علاقائی جنگیں لڑی گئیں۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں کچھ سیاسی تبدیلیاں کیں اور ایک مجلس شوریٰ قائم کی۔ مرحوم نے امریکہ کے ساتھ بہتر تعلقات میں کلیدی رول ادا کیا۔ ان کے بعد ان کے بھائی ولی عہد شہزادہ عبداللہ تخت نشیں ہوئے۔

● ممتاز اسکالر، ادیب، شاعر اور لغت نویس شان الحق حقی کا ۱۱ر اکتوبر ۰۵ء کو کینیڈا میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک سال سے کینسر میں مبتلا تھے۔ موصوف ۱۵ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ انہیں ۱۹۶۸ء میں تمغۂ قائداعظم اور ۱۹۸۶ء میں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ ان کی مختلف فنون میں خاصی تعداد میں کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں تار پیرہن (شاعری)، نکتۂ راز (تنقیدی مضامین)، خیابان پاک وغیرہ کافی مقبول ہوئیں۔ انہوں نے ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے ''ولیم انطونی وقلوپطرہ'' کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو اس وقت نایاب ہے۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری بھی ترتیب دی جس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ انہوں نے ''بہادر شاہ ظفر'' کے کلام کا انتخاب اور بھگوت گیتا کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا جسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کئے۔ ان کے علاوہ چانکیہ کی ارتھ شاستر اور جیک شیفر کی ''شین'' کا اردو میں ترجمہ کیا وہ ایک عرصہ تک ترقی اردو بورڈ پاکستان کے اعزازی سکریٹری رہے۔ مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۹۱ء میں کراچی کے کلفٹن میں ہوئی تھی۔ افتخار اجمل شاہین اور رفیع الدین راز نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے اپنے مضامین کا مجموعہ عنایت کیا تھا۔

ادارہ ان حضرات کی وفات حسرت آیات پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے مغفرت کی دعاء کرتا ہے!

——— امام اعظم

عبدالعلیم آسی ایوارڈ

مشہور شاعر اور مجاہد آزادی مولانا عبدالعلیم آسی کے نام پر دیئے جانے والے ادبی ایوارڈ کے سلسلے کا پروگرام انشاءاللہ اس سال کے اواخر میں منعقد کیا جائے گا۔

اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ۔۴ (بہار) فون: 06272-258755، موبائل: 9431085816

ڈاکٹر منصور عمر، شعبۂ اُردو، سی۔ایم۔کالج، دربھنگہ

قطعاتِ تاریخ بر وفاتِ مشاہیرِ ادب و سیاست

نظر برنی

خدا نے ہی بڑھایا ان کا رتبہ
کہ موت آئی بھی تو مکّہ میں آئی
ہے بزم مصرعۂ تاریخ برہم
نظر برنی ہیں اب جنت مکانی

۴۹

۲۰۵۴-۴۹=۲۰۰۵ء

شبیر احمد

چل بسا شبیر احمد دارِ فانی سے مگر
'اعتراف' و 'ہو بہو' کا ہم پہ ہے نشہ سوار
مصرعۂ تاریخ یارو ہوگیا ہے پھر سیہ
خادمِ اُردو، صحافی تھا وہ افسانہ نگار

۷۵

۱۹۳۰+۷۵=۲۰۰۵ء

مائل ملیح آبادی

مائل کہانی کہہ کے جب بزم جہاں سے نکلا
ہمراہ اس کے نکلے سب 'کعبہ سے کربلا تک'
تاریخ یہ منصور کو ہاتف نے ہے بتائی
لے کر ''ادھوری بات'' جا پہنچا ہے وہ خدا تک

۲۰۰۵ء

رفیق زکریا

وہ ''محمد اور قرآں'' کا رفیق
عہد کا اپنے وہ بیشک تھا کلیم
ہوگئی تاریخ اب کے پھر 'اداس'
جا ملا رب سے وہ دانشور عظیم

۶۶

۲۰۰۵ء

شاہ فہد

پاگئے رحلت سعودی حکمراں یعنی فہد
عرش پر کاٹیں گے وہ جو فرش پر ہیں بوگئے
مصرعۂ تاریخ کو ہم بخش دیں ''وادی''
کہ اب خادم حرمین تھے جنت مکانی ہوگئے

۲۱

۱۹۸۴+۲۱=۲۰۰۵ء

قمر توحید

موت نے جب آلیا توحید کو
ہوگئے، احباب سارے سوگوار
کیجیے تاریخ کو ہمدم عطا
تھا قمر توحید اک فکشن نگار

۸۹

۱۹۱۶+۸۹=۲۰۰۵ء

شان الحق حقیؔ

وہ جو ممتاز شاعر، ادیب ایک تھا
شانِ حق حقیؔ بھی ہم سے رخصت ہوا
ایک دانا جو نکلا ہے تاریخ سے
کیجیے فقط اب مغفرت کی دعاء

۵۶

۲۰۶۱-۵۶=۲۰۰۵ء

رؤف خیر، حیدر آباد

حمد باری تعالیٰ

(حواسِ خمسہ کے حوالے سے)

آپ اپنے کو ٹٹولا تو یہ قصہ دیکھا
ایک اک جس پہ مکمل ترا قبضہ دیکھا

کوئی پردہ نہ علاقہ ہے نہ حد تیرے لئے
چشمِ بینا نے عجب دیکھنے والا دیکھا

سننے والا ہے سدا اوّل و آخر تو ہی
سننے والا نہ کوئی تیرے علاوہ دیکھا

چار سو پھیلی ہوئی ہے تو ہے خوشبو تیری
چار سو چھایا ہوا تیرا سراپا دیکھا

ذائقہ تیرا ابھی تیرے نمک خواروں سے
چھوٹتا ہی نہیں، چسکا ہی کچھ ایسا دیکھا

کون ہے تیرے سوا ہاتھ پکڑنے والا
دستگیری کو ہمیشہ تجھے آتا دیکھا

تو کوئی روپ نہ بہروپ کوئی رکھتا ہے
تو تو وہ ہے کہ ترا باپ نہ بیٹا دیکھا

خیرؔ ہر دور میں معیارِ حقیقت ہے جہاں
شر پسندوں کا وہیں رنگ بھی اڑتا دیکھا

افتخار اجمل شاہین، کراچی

نعت پاک ﷺ

انہیں کو یاد کرتا ہوں جو میں ہوتا ہوں مشکل میں
امیدیں جگمگا اٹھتی ہیں پھر کاشانۂ دل میں

اسی سے ذات مومن کی عبارت ہے اگر دیکھیں
جلالِ کبریا دل میں، جمالِ مصطفیٰ دل میں

محمد مصطفیٰ رہبر وہی ہیں رہنما اپنے
نہ خطرہ اب کوئی مجھ کو نہ دشواری ہے منزل میں

میں جلوہ آپ کا دیکھوں کرم آقا جو ہو جائے
بصارت اتنی آجائے اگر اس آنکھ کے تِل میں

مرے مولا محمدؐ ہیں وہی مشکل کشا میرے
وہ ہیں پیشِ نظر میرے ہر اک مشکل مراحل میں

نہیں طوفاں کا ڈر مجھ کو، بفیضِ مصطفیٰ اب تو
نہیں ہوتا شمار اپنا سبکسارانِ ساحل میں

میں اوصافِ نبی لکھوں، لکھوں کیسے میں کیا لکھوں
نہ خامے میں یہ قوت ہے نہ طاقت ہے مرے دل میں

ابھی تک اس مکاں پر ہے ہوا و حرص کا قبضہ
ابھی کیسے کہوں شاہیںؔ کہ وہ رہتے ہیں اس دل میں

پروفیسر نظیر صدیقی کے خطوط

(۱۷)

اسلام آباد: ۷رفروری ۱۹۹۷ء۔ برادرعزیز ڈاکٹر امام اعظم السلام علیکم، تقریباً ایک مہینہ ہو رہا ہے کہ میں نے اپنی نئی اُردو کتاب 'ادبی جائزے' کی چار جلدیں آپ کے گھر کے پتے (مجھے بتایئے کہ آپ کا بہتر پتا کون سا ہے۔ گھر کا پتایا قلعہ گھاٹ والا پتا) پر Surface Mail کے ذریعے رجسٹرڈ بک پوسٹ بھیجیں۔(۱) ایک آپ کے لئے (۲) ایک ڈاکٹر منصور عمر کے لئے (۳) ایک ڈاکٹر نارنگ کے لئے اور (۴) ایک بھائی مظہر امام کے لئے ممکن ہے کتابیں آپ کو مل گئی ہوں یا ایک آدھ ہفتے میں مل جائیں۔ بہر حال رسید جلد سے جلد بھیجیں۔ بھائی مظہر امام سے میں نے درخواست کی تھی کہ وہ خشونت سنگھ سے مل کر میرے لئے کچھ کتابیں لے لیں اور میرے نام بھیج دیں۔

خشونت سنگھ کی ایک اور کتاب Sex, Scotch and Scholarship کے مطالعے کا مجھے بے حد اشتیاق ہے۔ بھائی مظہر امام کے نام Glimpses بھیجتے وقت لکھ دیجئے کہ وہ میرے لئے یہ کتاب بھی حاصل کریں اور جلد سے جلد بھیج دیں اور سب بدستور۔ یہ تین کتابیں آپ جلد سے جلد بھیج دیں۔

مخلص: نظیر صدیقی

(۱۸)

اسلام آباد: ۱۳رفروری ۱۹۹۷ء۔ بھائی کل آپ کا خط مورخہ ۲۸رجنوری ملا۔ خوشی ہوئی کہ 'ادبی جائزے' کی تین جلدیں بری حالت میں سہی آپ تک پہنچ گئیں۔ چوتھی جلد جو غائب ہوگئی ڈاکٹر منصور کے لئے تھی۔ پھر کبھی دوبارہ بھیج دوں گا۔

عید سے دو روز قبل ایک دوست کے ہاں ان کے ایک دوست امریکہ سے آئے۔ دوسرے دن ہندوستان (دہلی) جانے والے تھے۔ میں نے ان سے پہلی ہی ملاقات میں گزارش کی کہ میری کچھ کتابیں ہندوستان لیتے جائیں۔ چنانچہ ان کے ہاتھ میں نے آپ کے نام 'ادبی جائزے' کی تین جلدیں بھیجی ہیں جو رجسٹرڈ بک پوسٹ کے ذریعے آپ تک پہنچیں گی۔ ان تین جلدوں میں Glimpses کی ایک جلد مظہر امام کے لئے ہے۔ 'ادبی جائزے' کی ایک جلد ڈاکٹر ملک راج آنند کے لئے اور ایک جلد شمس الرحمن فاروقی کے لئے۔ فاروقی کا خط آیا تھا۔ انہیں آپ کے ذریعے Glimpses مل گئی۔ ابوالکلام قاسمی نے اب تک رسید نہیں بھیجی۔ ڈاکٹر ملک راج آنند نے آپ کے پاس رسید بھیج دی تھی۔ اگر آپ وہ رسید بھیج سکیں تو بھیج دیجئے گا۔ ابھی تک الیاس احمد گدی کا کوئی خط نہیں آیا۔ انہیں غیاث کے پتے پر بھی خط مل سکتا تھا۔ دونوں سگے بھائی ہیں۔ آنا جانا رہتا ہے۔ آپ سب لوگوں کو عید مبارک۔ خدا بخش لائبریری کے حبیب الرحمن چغائی کے نام ایک خط بھیج رہا ہوں۔ پوسٹ کر دیجئے گا۔ آپ کا کالج آپ کے گھر سے کتنی دور ہے کیا آپ کے کالج کے

پتے پر خط یا کتاب بھیجنا محفوظ نہ ہوگا؟ اور سب بدستور۔ یہ خط بڑی عجلت میں لکھ رہا ہوں۔ آپ کا:نظیر صدیقی

(۱۹)

اسلام آباد: ۲۰ر مارچ ۱۹۹۷ء۔ برادر عزیز ڈاکٹر امام اعظم السلام علیکم آپ کا خط مورخہ ۲۲ر فروری ڈاکٹر مظفر مہدی کی تین کتابوں کے ساتھ آٹھ دس دن پہلے مل گیا تھا۔ جواب قدرے تاخیر سے اس لئے جارہا ہے کہ ڈاکٹر منصور عمر کی کتاب 'اختر انصاری دہلوی' پر میرا کالم ۱۹ مارچ کو آنے والا تھا۔ میں نے سوچا کالم آجائے تو ساتھ ہی روانہ کردوں اور اگر ہو سکے تو اس دوران میں ڈاکٹر مظفر کی کتاب 'اعتراف' کا پیش لفظ بھی لکھ لوں۔ شکر ہے کہ یہ دونوں کام کل ہو گئے۔ کالم کی دو عکسی نقلیں اور پیش لفظ اس خط کے ساتھ ارسال ہیں۔ خدا کرے دونوں حضرات کالم اور پیش لفظ سے مطمئن ہو سکیں۔

آپ نے جو دو خط پوسٹ کرنے کیلئے بھیجے تھے وہ پوسٹ کردیئے گئے۔ میں نے آپ کے نام کتابوں کے دو پیکٹ بھیجے۔ پہلے پیکٹ میں غالباً صرف 'Glimpses' کی چار جلدیں تھیں یا 'ادبی جائزے' بھی؟ ذرا لکھ بھیجئے تا کہ میرے حافظے کی اصلاح ہو سکے۔ شاید پہلے ہی پیکٹ سے ڈاکٹر منصور کے نام کی جلد راستے میں نکال لی گئی۔ دوسرا پیکٹ جو عید کے بعد آپ کو ملا ہوگا اس میں بھائی مظہر امام کے نام Glimpses تھی اور ڈاکٹر ملک راج آنند کے نام 'ادبی جائزے' اور شمس الرحمٰن فاروقی کے نام 'ادبی جائزے'۔ براہ کرم دونوں پیکٹوں کا حساب آپ لکھ بھیجیں تا کہ میں واضح طور پر سمجھ سکوں کہ میں نے کس کس کو کون سی کتاب / کتابیں بھیج دیں۔ براہ راست رسید سوائے فاروقی کے کسی اور کی اب تک نہیں آئی۔ فاروقی نے Glimpses کی رسید بھیجی تھی۔ براہ کرم گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر ملک راج آنند کی رسیدوں کی عکسی نقلیں بھیج دیجئے۔

ابوالکلام قاسمی تو رسید بھیجنے اور خط لکھنے کے قائل ہی نہیں۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ میں نے آپ کے ذریعے مظہر امام کو انگریزی اور اُردو دونوں کتابیں بھیج دی ہیں۔ شاید ڈاکٹر منصور کے لئے گم شدہ کتاب (ادبی جائزے) کی تلافی نہیں کرسکا ہوں۔ اگر مظہر امام خشونت سنگھ سے کوئی کتاب حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں تو براہ کرم وہ کتاب مجھے جلد سے جلد بھیج دی جائے۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی کتاب ماہِ رواں کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ 'قربتوں کی دھوپ' پر آپ کا مرسلہ تبصرہ دیکھا۔ اچھا ہے۔ شہاب کی خودنوشت 'شہاب نامہ' بڑی مقبول کتاب ہے۔ انہوں نے بڑی اچھی نثر لکھی ہے۔ ویسے واقعات زیادہ معتبر نہیں۔ پروین شاکر بنام نظیر صدیقی (خطوط) ماہِ رواں میں شائع ہو جائے گی۔ آپ کے لئے بھیجوں گا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے لئے ابھی تک کچھ نہ بھیج سکا۔ ان سے میری شرمندگی اپنی جگہ پر ہے۔ اتنے جنجال میں پھنسا رہتا ہوں کہ بس۔

ڈاکٹر مظفر مہدی اور ڈاکٹر منصور عمر کے نام خطوط بھیج رہا ہوں۔ انہیں دے دیجئے گا۔ میرے خطوط کا جواب حتی الامکان جلد دیا کیجئے۔ آپ کا:نظیر صدیقی

پروفیسر وہاب اشرفی، پٹنہ

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' پر ایک نوٹ

کسی بھی ادبی کام کی پذیرائی اور اہمیت مصنف کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے اور لگتا ہے جیسے اس نے یوں ہی مہ و سال نہیں گزار دیئے بلکہ وہ کسی مسعود مقصد کے لئے جیتا رہا۔ مقصد کی تکمیل بذات خود ایک بڑا انعام ہے لیکن تصنیف یا تالیف کی پذیرائی کے لئے بھی وقت چاہئے، عصری قدر و منزلت کی ادبی کے علاوہ دوسری وجہیں بھی ہوسکتی ہیں۔ لیکن ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی مصنف اور تصنیف زندہ ہیں تو ان کی حیثیت کلاسیکی ہوجاتی ہے اور متعلقہ تصنیف ادب کے سرمایہ میں اضافے کا سبب ہوتی ہے۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' عام طور سے پسند کی گئی ہے اور کی جارہی ہے۔ یہ میرے لئے اچھی بات ہے۔ لیکن پسند کی جاتی رہے گی اس کا میں صرف اندازہ کرسکتا ہوں اور یہ بھی میرے لئے خوش آئند امر ہے، چاہے یہ میری خوش فہمی ہی کیوں نہ ہو۔ بہر حال پہلی جلد تا ساتویں جلد تک کی تفصیل اس طرح ہے:

جلد اوّل۔ مصری ادب، اشوری ادب، یونانی ادب، چینی ادب، عبرانی ادب، کیلٹی ادب، ہسپانوی ادب، لاطینی ادب، سنسکرت ادب، پالی ادب، فرانسیسی ادب۔

جلد دوم۔ مصری ادب، یونانی ادب، لاطینی ادب، جرمن ادب، امریکی ادب، اسکینڈ نیویائی ادب، سنسکرت ادب، تامل ادب، فارسی ادب، عربی ادب۔

جلد سوم۔ یونانی ادب، اطالوی ادب، فرانسیسی ادب، ہسپانوی ادب، کیلٹی ادب، سنسکرت ادب، ڈنمارک ادب، اسکاچستانی ادب، روسی ادب۔

جلد چہارم۔ جرمن ادب، سویڈی ادب، پرتگالی ادب، ڈچ ادب، تامل ادب، پنجابی ادب، مراٹھی ادب، بنگالی ادب۔

جلد پنجم۔ یونانی ادب، جرمن ادب، فرانسیسی ادب، انگریزی ادب، عربی ادب، ہندی ادب، اُردو ادب۔

جلد ششم۔ روسی ادب، بنگلہ ادب، ترکی ادب، تامل ادب، مراٹھی ادب، ملیالم ادب، فارسی ادب، اُردو ادب۔

جلد ہفتم۔ فرانسیسی ادب، انگریزی ادب، جرمن ادب، ڈچ ادب، امریکی ادب، کنڑ ادب، تلگو ادب، فارسی ادب، اُردو ادب۔

یوں تو یہ تاریخ پندرہ برس میں مکمل ہوئی لیکن اس کے مواد کی فراہمی کا کام اس عرصے سے بہت پہلے شروع ہوا۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب میری کم از کم بیس برس کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے۔

اس پروجیکٹ کی تکمیل اور اشاعت کے مرحلے میں کئی بزرگوں نے میری بڑی مدد کی۔ میرے دیرینہ کرم فرما اور بزرگ سید شاہ عطاء الرحمٰن کاکوی نے میرے عزم کا احساس کرتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کے لئے حافظ کا یہ مصرع پڑھا: ہمہ آفاق گرفت و ہمہ اطراف کشاد۔

فعل ماضی کے مصرعے نے گویا مجھے ایک نیا حوصلہ بخشا۔ افسوس کہ مصنف، محقق، مترجم اور شاعر عطا کاکوی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ لازماً وہ اس پروجیکٹ کی تکمیل پر بہت خوش ہوتے۔ دوسری جلد میں انہوں نے اپنی واضح رائے بھی دی، جو کتاب کی زینت بنی۔

دوسری علمی و ادبی شخصیت جس نے اوائل ہی میں مجھے ذہنی تحفظات کے بغیر داد دی وہ محترم علی جواد زیدی ہیں۔

انہوں نے اپنے رسالے میں پہلی جلد پر تفصیلی تبصرہ کیا۔ اس میں میری کسی خواہش کو دخل نہ تھا۔ وہ اس وقت بمبئی میں تھے اور میں رانچی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اُردو تھا۔ میں نے جب وہ تبصرہ پڑھا تو مجھے اپنی کتاب کی اہمیت و افادیت کا مزید احساس ہوا اور مجھے لگا کہ جو کام میں کرنا چاہ رہا ہوں، واقعی وہ عظمت کی سرحدوں کو مس کر سکتا ہے۔ وہ تبصرہ بھی دوسری جلد کو مزین کر رہا ہے۔ پھر مجھے ایسے خطوط ملنے لگے جن میں تعریف و توصیف کا بڑا والہانہ انداز تھا۔ ایسے خطوط میں ایک خط اپنی شرطوں پر جینے والے اُردو کے مشہور انفرادی اسلوب کے مالک جناب وارث علوی کا تھا۔ میں نے انہیں اپنی کتابیں بھجوائی تھیں جن میں ''تاریخ ادبیات عالم'' کی متعدد جلدیں بھی تھیں۔ موصوف نے میری کتابوں سے آشنائی کے بعد حیرت کا اظہار کیا تھا۔ بطور خاص تاریخ کی جلدوں کے باب میں لکھا کہ وہ تمام جلدیں تیزی سے چاٹ گئے، اس طرح جیسے بھوکا شیر...... پھر انہوں نے میرے مطالعے کی وسعت اور اس پروجیکٹ کی اہمیت کی کھل کر تعریف کی۔ ظاہر ہے اس خط نے مجھے جینے اور لکھتے رہنے کا مزید ولولہ بخشا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ ان کی مصروفیت کا مجھے علم ہے۔ پھر وہ اپنی تصنیف و تالیف میں از سر نو سرگرم عمل ہو گئے ہیں۔ ادبی فتوحات کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ ادھر چار مہینے میں ان کی تین ضخیم کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور سب کی سب کچھ ایسے نکات کو سامنے لاتی ہیں جن سے ہماری ثقافت کے خدوخال مزید ابھر گئے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے سلسلے میں نظریہ سازی کا بار بھی انہیں کے کاندھوں پر ہے۔ ایسے میں وہ وقت نہیں نکال سکتے تھے کہ ''تاریخ ادبیات عالم'' پر کوئی تفصیلی نظر ڈال کر میری حوصلہ افزائی کر سکتے۔ لیکن انہوں نے ابتدا ہی میں میری دوسری نگارشات کے حوالے سے جس طرح ادبیات عالم کا خیر مقدم کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے اور اس کتاب کا جزو خاص بھی ہے۔ عجیب بات ہے کہ زندگی کے آخری مرحلے میں ادبی نقطۂ نظر سے ہم ایک ہی سمت رواں دواں ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ شعر و ادب کی اسی طرح خدمت کرتے رہیں۔ ویسے بھی ادبی تاریخ میں ان کی جگہ محفوظ ہو چکی ہے۔

ناانصافی ہوگی اگر میں انہیں فراموش کر دوں جنہوں نے میری درخواست پر بعض جلدوں کا پیش لفظ لکھا یا مقدمہ قلم بند کیا۔ ان میں سرفہرست جناب شمس الرحمن فاروقی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ انہوں نے اپنی گراں قدر رائے بڑی تحقیق اور محنت سے قلم بند کی، غیر ملکی زبانوں میں ہونے والے ایسے کاموں پر ایک نگاہ ڈالی جن میں مغرب و مشرق کے قاموس نگاروں کی کاوشوں کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے ادبیات عالم کے حسن پر نگاہ ڈالی، قبح کے باب میں بھی اشارے کیے اور نتیجہ یہ نکالا کہ میری تاریخ ہندوستانی ادب کے سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ رائے میرے لئے غیر معمولی پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔ ان دنوں مجھ سے وہ کچھ خفا خفا سے ہیں، معاملہ ادبی نقطۂ نظر کا ہے، اور کچھ بھی نہیں۔ بہر طور، موصوف کا متعلقہ پیش لفظ 'ادبیات' کی اہمیت فزوں تر کر رہا ہے۔

لیکن میرے دیرینہ کرم فرما اور دوست جناب شمیم حنفی نے ایک الگ طرح کی نوازش کی، بالکل اس امر کو فراموش کرتے ہوئے کہ میں ان کا ہمعصر اور ہم عمر ہوں اور ادبی تنقید کے جوکھم میں ساتھ ساتھ لگا ہوں۔ انہوں نے ایک ایسا مقدمہ قلم بند کیا جو میری توقع سے کہیں زیادہ بھرپور اور اہم تھا، کسی ادبی تعصب کے بغیر ایسی پذیرائی کہ شاید و باید...... اتنا ہی کچھ ہوتا تو بھی میں ان کا احسان مند ہوتا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب موصوف نے جناب اسلم پرویز کے رسالہ ''اُردو ادب'' میں میری تاریخ پر تبصرہ کیا۔ مقدمے میں جو کچھ لکھا تھا اس میں تخفیف نہیں تھی، اضافہ تھا...... اور جلدوں کے تواتر کو ''کتابوں کے عظیم الشان سلسلے'' سے تعبیر کیا تھا۔ پھر میرے اسلوب کی روانی اور شگفتگی نیز ترسیلیت پر خاصا زور صرف کیا تھا۔

یہ میرے لئے بڑا قیمتی انعام تھا اور ہے۔

جناب مظہر امام میرے بزرگ دوست اور ہم وطن ہیں۔ انہوں نے بھی جس طرح ''تاریخ ادبیات عالم'' کی پذیرائی کی وہ میرے لئے مزید تحرک کا باعث بنی۔ انہوں نے اپنے 'پیش لفظ' میں ٹینی سن کی نظم ''اناک آرڈن'' کے میرے تیس سال پہلے کے ترجمے کی اشاعت کا تذکرہ کیا اس سے مجھے خود اندازہ ہوا کہ میں کب سے مغربی ادبیات سے وابستہ ہوں۔ دراصل میں یہ چاہتا رہا کہ دنیا کے بہترین ادب تک ہماری رسائی ہوتی رہے اور اردو ادب کے سرمائے میں کسی نہ کسی طرح اضافہ ہو۔ پروفیسر قمر رئیس نے مجھ پر کرم کی بارش کردی۔ ایک تو انہوں نے میرے تعلق سے ایک تنقیدی اور تاثراتی مضمون قلم بند کیا جو ''کتاب نما'' دہلی میں شائع ہوا۔ پھر انہوں نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کی چھٹی جلد کا 'پیش لفظ' لکھنے کی بھی زحمت کی۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض مرحلے میں ترقی پسندوں سے میرا بڑا اختلاف رہا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ مرحلہ جو میرے لئے سخت جان ہوتا ہے اس میں معاون بننے والے ایسے ہی احباب اور بزرگ ہوتے ہیں۔ میں جناب قمر رئیس کا سپاس گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیت، علالت اور مسلسل صعوبت سفر کے باوجود وقت نکالا اور میرے لئے ایسے جملے تراشے جو ہمیشہ میری رہنمائی کرتے رہیں گے اور مجھے حوصلہ بخشتے رہیں گے۔

ان کے علاوہ وہ اصحاب جنہوں نے کھلے دل سے ''تاریخ ادبیات عالم'' کے باب میں میری معاونت فرمائی، ان میں وہ بھی ہیں جو ادیب ہیں اور وہ بھی جو ادب سے تعلق نہ رکھنے کے باوجود تعلیمی اور علمی سروکار سے مسلسل رابطہ رکھتے ہیں۔ میرے بزرگ دوست پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے ابتدا ہی میں چند سطور لکھ کر اس پروجیکٹ کی پذیرائی کی تھی۔

عالی جناب عزت ماب اخلاق الرحمٰن قدوائی کا سراپا سپاس گذار ہوں کہ موصوف نے دوران ملازمت میری ترقی کے ہر مرحلے میں میری معاونت کی۔ نیز جب میں نے اس پروجیکٹ کو ان کے سامنے رکھا اور کچھ عرصہ کے بعد جب ایک جلد مکمل کی اور اس کے محتویات سے انہیں آگاہ کیا تو موصوف نے اپنی گراں قدر رائے انگریزی میں قلم بند کی اور میرے حوالے کیا۔ اس وقت موصوف بہار کے مقبول عام گورنر تھے۔ ان کی اس حوصلہ افزائی سے یہ ہوا کہ میں آگے ہی کی طرف دیکھتا رہا، بغیر اس احساس کے کہ یہ کام مکمل ہو سکے گا یا نہیں۔ جب بھی موصوف سے ملاقات ہوتی ہے تو مجھے اپنی زندگی کے وہ لمحے مسلسل یاد آنے لگتے ہیں جہاں ان کی معاونت نے مجھے بڑا اسہارا دیا۔

پروفیسر سید محمد عقیل سے میرا رشتہ بزرگ اور خرد کا رہا ہے۔ میں نے اس لکشمن ریکھا کو پار کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، لیکن جب بھی اختلافی نوعیت کی باتیں آئیں، ان کے اظہار میں گریز بھی نہیں کیا۔ لیکن ایسے معاملات سے ہمارے دل الگ نہیں ہوئے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جب میں نے ساتویں جلد کے 'پیش لفظ' کے سلسلے میں ان سے فون پر رجوع کیا تو انہوں نے فوراً حامی بھرلی اور کم وقت میں اپنے تاثرات جامعیت کے ساتھ لکھ کر بھیج دئے، ایسے میں جب وہ ترقی پسندی پر ایک مستقل کتاب لکھنے کے سلسلے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ان کے جائزے میں بعض نکات ایسے ہیں جو یقیناً میری کتاب کی اہمیت کو واضح کررہے ہیں۔ یہ میرے لئے بہت اہم ہے۔

میں سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نسیم قریشی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ وہ بھی اپنی علم دوستی کے سبب میری اس کتاب کی پذیرائی میں رطب اللسان رہے اور اپنی گراں قدر رائے سے اسے مزین کیا۔

غرض کہ ادیبوں، شاعروں، نقادوں، بزرگوں اور دوستوں کے تعاون سے اس مرحلے میں آ گیا کہ کہہ سکوں کہ جو عزم میں نے کر رکھا تھا وہ اختتام کو پہنچا۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' ایک بڑا قاموسی کارنامہ

اکیسویں صدی نئے انقلاب سے دوچار ہے، عظمت کے پہاڑ پر شکنیں ہیں، جبینِ اقتدار پر بَل ہیں، سچائی کی تصویریں آنکھیں دیکھ رہی ہیں، ہر طرف تڑپتی ہوئی چنگاریاں ہیں اور دلوں کو تازہ کرنے والے نغمے بھی ہیں۔ ایسے میں اردو ادب کے ایک روشن ضمیر درویش نے ہفت آسماں کو منظر گلستاں بنادیا ہے۔ اور ذوق وشوق کو مہمیز لگانے کے لئے قلندرانہ مہر ثبت کردی ہے۔ تجسس کی جہتوں سے بھرپور پروفیسر وہاب اشرفی کی کتاب ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی ساتوں جلد پڑھنے کے بعد حقائق، تجزیوں اور باعلم فیصلوں کی وجہ سے ذہنی کشادگی اور توانائی ضرور ملتی ہے۔ دریا کو کوزے میں سمو کر انہوں نے اُردو کے ادبی سرمایے میں بصیرت افروز اضافہ کیا ہے۔ یہ بڑا قاموسی کام کسی بڑے ادارے کا تھا لیکن اُردو کی بدقسمتی رہی ہے کہ صحت مند روایت کی ابتدا فردِ واحد نے کی ہے اور دامے، درمے، قدمے، سخنے اسے پایۂ تکمیل تک تن تنہا ہی پہنچایا ہے۔ وہاب اشرفی کی کرشمہ سازی وقیع اور نادر ہے۔ ادب کی اس عالمی تاریخ میں تہذیب اور ثقافت کے گہرے رمز ہیں، روایت کی نشاندہی ہے، فن کے نئے پہلو کا ارتقا ہے، اصول اور مبادیات کی تفصیل ہے، مسائل ونظریات کی درجہ بندی ہے اور عالمی ادب کی توسیع سے واقفیت ہے۔

وہاب اشرفی نے گم گشتہ کو جیسی زبان دی ہے یہ تحدیث نعمت ہے۔ عالمی زبان کے ادب کی انواع کی اکائی اعلیٰ ترین اور اولین کی معنویت سے بھرپور نظریاتی انسلاک رکھتی ہے۔ اس میں ضمنی اور ثانوی کچھ بھی نہیں ہے بلکہ اظہار وابلاغ کا زیر وبم ہے، آفاقی بلند آہنگی ہے اور وہاب اشرفی کے دوررس ذہن کی بلند پروازی ہے۔

''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کے اس مواد میں ترتیب، انتخاب اور دروبست کی مناسبتیں ہیں جو جذبے اور فکر کو مہمیز کرتی ہیں اور افہام وتفہیم کی خوشگوار فضا قائم کرتی ہیں۔ البتہ اردو ادب کی تاریخ میں بعض اہم اور رجحان ساز نام کا شمار نہیں ہے اور دوست داری کو بھی راہ دی گئی ہے۔ پھر بھی اس میں بہت بڑے کینوس کے بطون کی ہنرمندی ہے۔ کلیت کے ادراک کی تجزیہ کاری کے ذریعے جس سرچشمے سے وہاب اشرفی نے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے اس کی مثال شاید آگے بھی نہ ملے۔ علامہ اقبال نے وہاب صاحب کے لئے ہی کہا تھا۔

اس ذرّے کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم — یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی — یہ ہستیٔ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

ڈاکٹر مجید بیدار، شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

تالیف وترتیب کے رمز شناس۔ پروفیسر وہاب اشرفی

غیرافسانوی ادب کے ذخیرے میں عظیم الشان اضافے کی جانب پیش رفت کا آغاز بلاشبہ دکن کی سرزمین سے ہوا جبکہ مہدی افادی کے مشوروں کو قبول کرتے ہوئے اردو میں سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے 'اُردو انسائیکلو پیڈیا' کی پہلی جلد شائع کی اور اس عملی کام کے ذریعے اُردو میں قاموسی تحقیق اور مخزن علوم وفنون کی پیش کشی کی روایت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس سلسلہ کی دیگر کتابوں میں ''غزل سائیکلو پیڈیا'' اور ''نظم انسائیکلو پیڈیا'' کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو کے قاموسی ادب میں یہ ایسے اضافے ہیں کہ جن کے توسط سے علم وادب اور شعرو شاعری کے تاریخی ارتقاء اور ہر دور میں پیدا ہونے والی تبدیلی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جس سے کسی قوم کی ذہنی اور تہذیبی نشوونما کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کونسل برائے فروغِ اُردو زبان نئی دہلی نے ''اُردو انسائیکلو پیڈیا'' کی تین جلدیں پیش کرکے اُردو کے قاموسی ادب کی تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ کیا لیکن تمام قاموسی کتب کے مقابلہ میں تاریخ ساز اضافہ پروفیسر وہاب اشرفی کے شاہکار ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' جلد اوّل تا ہفتم سے ہوا۔ جسے ڈاکٹر وہاب اشرفی کا ''علمی مہم'' قرار دینا حق بجانب ہے۔ عالمی زبانوں کے ادبیات اور ان کے ذریعے ملک وقوم ومعاشرہ میں پیدا ہونے والے تغیرات کی نشاندہی کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی نے نہ صرف ترجمانی کا حق ادا کیا ہے بلکہ عالمی سطح پر ادبیات کو متاثر کرنے والی تحریکات اور اس کے پس منظر کو بھی نمایاں کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے ترجمہ اور ترجمانی سے ہی کام نہیں لیا بلکہ اپنے زورِ قلم سے مختلف سماجوں اور تہذیبوں کے درمیان ربط وتعلق اور کشیدگی کے اثرات کی نمائندگی کے ذریعے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہر زبان کا ادب اس کے اخلاق، کردار، تہذیب اور سخن فہمی وسخن سنجی کا ورثہ ہوتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق نثر سے ہو یا شاعری سے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے ہر زبان کے نہ صرف لسانی آغاز وارتقاء سے بحث کی ہے بلکہ اس کے علمی وادبی ذخیروں سے گفتگو کرتے ہوئے شعری، افسانوی اور غیر افسانوی خصوصیات سے آگاہی بھی دی ہے۔ سات جلدوں پر مشتمل ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' کو صرف ایک منصوبہ بند تحقیقی کام کا درجہ ہی نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسے مہماتی کارنامے کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ داستانوی تاریخ میں جس طرح حاتم طائی اور سندباد جہازی نے قصوں اور کہانیوں کی دنیا میں کئی مہمات سرکی ہیں۔ اسی طرح عہد جدید کے ایک ہندوستانی نے بیسویں

صدی کے اس سائنسی دور میں وہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس طرح سائنس داں کسی گم شدہ سیارے یا پھر محکمہ آثار قدیمہ کے ماہرین تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو ملانے اور قدیم تاریخی آثار کو منظر عام پر لانے کی جستجو کرتے ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی نے "تاریخِ ادبیاتِ عالم" کی سات جلدیں تحریر کر کے تحقیق و تنقید کے میدانوں میں ہی اضافہ نہیں کیا بلکہ تالیف و ترتیب (Editing and Compiling) کی دنیا میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اُردو ادب میں ابھی تک صرف افسانوں، ڈراموں، مضامین اور انشائیوں کی ترتیب یا پھر نصابی کتب کی تالیف پر توجہ دی جاتی رہی ہے جب کہ عالمی زبانوں کے ادبیات اور ان کی تالیف و ترتیب کے علاوہ اس کے تعارفی نوٹ پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ اُردو کے نامور مترجمین جیسے ڈاکٹر سید عباد حسین، سید ہاشمی فرید آبادی اور عنایت اللہ دہلوی کے ذریعے بھی یہ کام انجام نہ پا سکا۔ اُردو کے غیر افسانوی ادب کے اہم مترجمین میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن ان عظیم ہستیوں کے ذریعے بھی جو کام تکمیل کے مرحلے کو نہ پہنچ سکا، اس بارگراں کو پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنے سر لیا اور تھوڑے سے وقفہ میں "تاریخِ ادبیاتِ عالم" کی سات جلدیں مرتب کر کے تخلیق کار کی جرأت کو شرما دیا۔ بلاشبہ ادبی تاریخ تحریر کرنا یا عالمی زبانوں کے ادبیات کا خاکہ مرتب کر کے تاریخی ترتیب میں اس کا جائزہ لینا کوئی تخلیقی کام نہیں ہے لیکن جان کو جوکھم میں ڈال کر پروفیسر وہاب اشرفی نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے تو بلاشبہ انہوں نے تخلیق کار کے کرب سے زیادہ دُکھ جھیلا ہے اور ان کی کتاب "تاریخِ ادبیاتِ عالم" کی سات جلدوں کی اشاعت پر اُن کے کارناموں کی ستائش درحقیقت تخلیق کار سے زیادہ کرب اور دُکھ جھیل کر اُردو داں طبقہ کو عالمی زبانوں کے ادبیات سے روشناس کروانے کے مترادف ہے۔ بلاشبہ وہاب اشرفی کی اس خدمت کو اُردو زبان و ادب کی تاریخ، دنیا میں زبانوں اور اس کے ادبیات کے وجود تک سراہتی رہے گی۔

ڈاکٹر منصور عمر، دربھنگہ

تاریخِ ادبیاتِ عالم۔ قاموسی تصنیف

''تاریخ ادبیاتِ عالم'' پروفیسر وہاب اشرفی کا وہ تاریخی کارنامہ ہے جس کی نظیر نہ صرف یہ کہ اُردو میں بلکہ عالمی ادب میں بھی ملنی مشکل ہے۔ سات جلدوں پر مشتمل تقریباً تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ایسا تحقیقی کارنامہ انجام دینا کسی جماعت یا کمیٹی کے لئے بھی آسان نہ تھا۔ مگر پروفیسر وہاب اشرفی نے تن تنہا اس گراں قدر اور بیش بہا خدمات کو انجام دے کر یہ ثابت کردیا کہ اگر کوئی شخص عزم مصمم اور جذبۂ صادق کے ساتھ کسی کام کا ارادہ کرلے تو وہ کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہے گا۔

''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی حیثیت قاموسی تصنیف کی ہے۔ اس طرح کی قاموسی تصانیف کے نمونے سب سے پہلے عربی زبان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً مجموعۂ احادیث اور تاریخ طبری وغیرہ کی اہمیت وانفرادیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ یا پھر سترہویں صدی عیسوی میں قاموسی تصانیف کے کچھ نمونے فرانسیسی اور انگریزی زبان وادب میں بھی مل جاتے ہیں۔ اردو زبان وادب بھی اس طرح کی تصانیف سے خالی نہیں ہے۔ اُردو کی مختلف لغات کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر جمیل جالبی کی تصنیف ''تاریخ ادب اردو'' کی مختلف جلدیں منظر عام پر آئیں تو اُردو دنیا ان کے اس کارنامے پر عش عش کراٹھی اور بجا طور پر وہ داد وتحسین کے مستحق ٹھہرے اور یہ کہا جانے لگا کہ جو کام ایک انجمن نہ کرسکی وہ ایک شخص نے کر دکھایا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ آنے والا وقت اُردو دنیا میں اب تک کے کارنامے کا سب سے بڑا دھماکہ کرنے جارہا ہے۔ چنانچہ جب وہاب اشرفی نے ''۱۹۹۱ء میں تاریخ ادبیاتِ عالم کی پہلی جلد پیش کی تو اردو دنیا اس کی طرف متوجہ ضرور ہوئی لیکن اس خوشی، حیرت اور تذبذب کے ساتھ کہ کیا وہاب اشرفی اتنے بڑے Project کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہوجائیں گے؟ اردو والوں کا یہ خوف بیجا نہ تھا کیوں کہ خود وہاب اشرفی ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' کی جلد اوّل کے دیباچہ گذارش احوال واقعی میں اسی کیفیت سے دوچار نظر آتے ہیں۔ ''کیا تاریخ ادبیات عالم کو قلم بند کرنا ممکن بھی ہے؟ کیا واقعی دریا کوزے میں سمٹ سکتا ہے؟'' آسانی سے جواب نفی میں دیا جاسکتا ہے، تو کیا ہم عالمی ادبیات سے واقف نہیں ہوسکتے؟ اور پھر اس کا جواب وہ ان الفاظ میں دیتے ہیں:۔

> ''میرا موقف ہے کہ مختلف قوموں اور ملکوں کے مرکزی ادبی دھاروں کو گرفت میں لینا ممکن ہے...... گراں قدر خیالات وتصورات کو سمیٹا جاسکتا ہے، عالمی شعر وادب کی مکمل تصویر نہیں تو اس کی ایک جھلک تو دیکھی اور دکھائی جاسکتی ہے۔''

ان کے اسی موقف نے ان کے برسوں پرانے خواب کی تعبیر پیش کرنے کا حوصلہ بخشا اور وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور وسائل کو بروئے کار لاکر یہ کارنامہ انجام دینے میں کامیاب ہوگئے۔ شروع میں ان کا ارادہ اسے چھ جلدوں میں پیش کرنے کا تھا لیکن اس کے پھیلاؤ نے وہ روپ اختیار کیا کہ مجبوراً اسے سات جلدوں میں پیش کرنا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ عربی، فارسی، انگریزی، اُردو اور دنیا کی مختلف زبانوں کی تاریخیں لکھی جاچکی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف انسائیکلوپیڈیا میں بھی عالمی ادب کے تذکرے مل جاتے ہیں لیکن وہاب اشرفی نے مختلف وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے انگریزی کی طرف رجوع کیا۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میں نے بیشتر انگریزی کتابوں سے ہی استفادہ کیا ہے۔...... میں نے ان دو جلدوں میں کہیں بھی انسائیکلو پیڈیا سے استفادہ نہیں کیا۔'' (جلد اوّل، ص ۱۱)

زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی پہلی جلد ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی ہے اور ساتویں جلد ۲۰۰۵ء میں گویا کل پندرہ سال کا عرصہ ہوا لیکن یہ تو مدت اشاعت ہوئی۔ مواد کی فراہمی اور پھر تخلیقی مراحل سے گذرنے کی مدت کا اضافہ کر لیا جائے تو بقول وہاب اشرفی:

''یوں تو یہ تاریخ پندرہ برس میں مکمل ہوئی لیکن اس کے مواد کی فراہمی کا کام اس عرصے سے بہت پہلے شروع ہوا۔ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب میری کم از کم بیس برس کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہے۔'' (جلد ہفتم، ص ۱۱)

پروفیسر وہاب اشرفی نے پہلی جلد کے پیش لفظ ''گذارش احوال'' میں لکھا تھا کہ ''کسی قوم کے افراد سے اگر ان کے خواب چھین لئے جائیں تو اس قوم کا زوال لازمی ہے، لہٰذا جو زوال پسند نہیں ہیں انہیں خواب دیکھنا چاہئے۔''

چنانچہ اس قول کے پیش نظر وہاب اشرفی نے ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی تصنیف و تالیف کا نہ صرف یہ کہ خواب دیکھا بلکہ اس کی تعبیر پیش کرنے میں اپنی عمر عزیز کے بیس قیمتی سال صرف کر دئے اور بالآخر ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ اس ضمن میں وہ ساتویں جلد کے پیش لفظ کا آغاز اس طمانیت کے اظہار سے کرتے ہیں کہ:

''الحمدللہ'' ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی ساتویں جلد بھی آپ کے پیش نظر ہے۔ اس طرح یہ پروجیکٹ مکمل ہوا اور مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔''

''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی ابتدائی دو جلدیں قبل مسیح کے ادبیات پر مشتمل ہیں جس کی مدت تقریباً چار ہزار سال قبل مسیح تک پھیلی ہوئی ہے۔ بقیہ پانچ جلدیں دو ہزار سال (بیسویں صدی عیسوی تک کے) ادب کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کل چھ ہزار سالہ ادب کے جائزے پر مشتمل ہے۔ ان میں دنیا کی تقریباً ۳۵ زبانوں کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے مثلاً:

مصری ادب، اشوری ادب، یونانی ادب، چینی ادب، عبرانی ادب، کیلٹی ادب، ہسپانوی ادب، لاطینی ادب، سنسکرت ادب، پالی ادب، فرانسیسی ادب، جرمن ادب، امریکی ادب، اسکینڈ ینویائی ادب، تامل ادب، فارسی ادب، عربی ادب، اطالوی ادب، ڈنمارک ادب، اسکاچیستانی ادب، روسی ادب، سویڈی ادب، پرتگالی ادب، ڈچ ادب، پنجابی ادب، مراٹھی ادب، بنگالی ادب، انگریزی ادب، عربی ادب، ہندی ادب، اردو ادب، ترکی ادب، ملیالم ادب، کنڑ ادب، تلگو ادب۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہاب اشرفی نے دنیا کی ۳۵ زبانوں کے ادب کا جائزہ پیش کر کے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے لیکن کشمیری ادب، اڑیا ادب اور میتھلی ادب کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ان زبانوں کے ادب کو بھی جائزے میں شامل کر لیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

بہرکیف! خوش نصیب ہیں ہم اُردو زبان و ادب والے کہ وہاب اشرفی نے دنیا کی بیشتر اہم زبانوں کے ادب کو ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کی شکل میں ہمارے سامنے نہ صرف یہ کہ پیش کر دیا بلکہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اردو والے اس سے کتنا فیضیاب اور سیراب ہوتے ہیں۔

ابوذر ہاشمی، نیشنل لائبریری، کولکاتہ

تاریخِ ادبیاتِ عالم اور وہاب اشرفی

وہاب اشرفی عبقری شخصیت کا نام ہے۔ ایک ایسی شخصیت جس کے نام سے اس کے عہد کی پہچان قائم ہوگی، ایک ایسی شخصیت جس نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے خدوخال اور کیف وکم اپنے اندر سمویا۔ لیکن جس کی تحقیقی بصیرت نے اسے ابتدا سے ہی قطب مشتری کی طرف راغب رکھا۔ وہ شخصیت جو معنی کی تلاش میں سرگرداں رہی اور ''معنی سے مصافحہ'' کر کے دم لیا۔ وہاب اشرفی ان چند معتبر نقادوں میں ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے عہد کے جید نقادوں سے لوہا منوایا ہے، بلکہ کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے جن کی توصیف کی ہے۔ وہاب اشرفی نے تنقید لکھنے سے پہلے ''قدیم ادبی تنقید'' کا مطالعہ پیش کیا تھا اور اس مطالعے پر کلیم الدین احمد کی صائب رائے شامل تھی۔ قاضی عبدالودود جیسے محقق بھی وہاب اشرفی کی تحقیقی صلاحیت کی داد دے چکے ہیں۔ وہاب اشرفی اردو تنقید کے ایک سالار رہے ہیں۔ جدید دور کے ادب کی تفہیم میں اگر وہاب اشرفی کی خدمات اہم رہی ہیں تو اردو میں مابعد جدید ادب کی تفہیم وتعبیر میں بھی وہ سب سے آگے رہے ہیں۔ الغرض وہاب اشرفی اردو ادب کا ایک ایسا نام بن گیا ہے جو مختلف حوالوں سے قاری کے سامنے اپنی ہشت پہلو شخصیت کے ساتھ آ کھڑا ہوتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کے احاطے کے باوجود وہاب اشرفی کے قلم کا خاکہ اس وقت تک نامکمل لگتا ہے جب تک اس میں تاریخِ ادبیاتِ عالم کا منفرد رنگ شامل نہ کیا جائے۔ ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' کی تالیف وتصنیف ان کا ایسا محترم ومقتدر کارنامہ ہے، جس نے وہاب اشرفی کو وقت اور مقام سے ماورا کر دیا ہے۔ شاید کہ اقبال نے ایسے ہی کام کرنے والوں کے لئے کہا تھا کہ 'بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا'۔

کسی بھی زبان کی تاریخ لکھنا ایک جوکھم کا کام ہے اور یہ جوکھم اکثر وبیشتر اکاڈمیاں یا ادارے اصحابِ فکر ونظر کا بورڈ تشکیل کر کے اٹھایا کرتی ہیں۔ حالاں کہ بعض جید قلم کاروں نے ادب اور زبان کی تاریخ انفرادی طور پر بھی لکھی ہے۔ لیکن اگر زبان کا سرمایہ ہزاروں برس پر بکھرا ہوا ہو تو، انفرادی سطح پر یہ کام کرنا انتہائی مشکل ہوا کرتا ہے۔ ایک آدھ زبان کی حد تک یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے لیکن دنیا کی اہم زبانوں کی تاریخ لکھنے کا حوصلہ رکھنا اپنے آپ میں ایک بڑی اور عجوبی بات ہے۔ وہاب اشرفی کا حوصلہ دیکھئے کہ تمام عالم کے ادبیات کی تاریخ لکھنے کا بیڑہ اٹھالیا۔ تاریخ لکھنے میں بھی وہاب اشرفی نے ماخوذ معلومات کی فراہمی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس میں اپنا نکتۂ نظر بھی شامل کیا ہے یہ ایک بڑی اور اہم بات ہے۔ عام طور پر ایسے تاموسی کام میں اپنے نکتۂ نظر کے اظہار کا جوکھم نہیں لیا جاتا۔ تاہم وہاب اشرفی نے یہ جوکھم اٹھایا ہے اور بڑی خوبی سے اٹھایا ہے۔ اس کام کی ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ کسی زبان کے ادب کی تاریخ جب ایک جلد میں نہ سما سکی تو اگلی جلد میں اس زبان کے ادب گذاروں کے کارناموں کے ذکر سے گریز نہ کیا گیا۔ یعنی حتی المقدور کوشش کی گئی کہ اس زبان کی تاریخ مکمل طور پر سامنے آ جائے۔ مثلاً چوتھی جلد میں بعض مغربی زبانوں کے علاوہ ہندوستانی زبانوں میں تامل، پنجابی، مراٹھی اور بنگلہ ادب کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ تمام ادب پر تو ہماری نظر نہیں، لیکن بنگلہ ادب کی پیش کردہ تاریخ سے اندازہ ہوتا

ہے کہ وہاب اشرفی نے کس جانفشانی سے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بنگلہ ادب کی تاریخ زبان کے مختصر تعارف سے شروع ہوتی ہے اور شاعری کے مذہبی رنگ سے لے کر اس کے تاریک دور، پندرہویں اور سولہویں صدی کا ادب، چیتنیہ کی تحریک، شعراء ارکان اور بعد کے مسلم شعراء کے ادب کی تاریخ کو پیش کرتی ہوئی جدید دور تک آتی ہے، اس کے تھیٹر اور ڈراموں کا جائزہ لیتی ہے، اور جب یہ محسوس کرتی ہے کہ رابندر ناتھ ٹھاکر کی خدمات کے لئے الگ صفحات کی ضرورت ہے تو یہ جائزہ اگلی یعنی پانچویں جلد میں پیش ہوتا ہے۔ اس طرح اگر چہ ایک زبان کے ادب کی تاریخ ایک جلد سے دوسری جلد میں پیوست ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے وہاب اشرفی کے احساس ذمہ داری کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ اتنے بڑے کام کا بیڑہ انفرادی سطح پر اٹھالیا جائے تو اس کے تسلسل میں چھوٹی موٹی کمی کا در آنا بھی لازمی بات ہے۔ اس کمی سے کام کی بڑائی پر حرف نہیں آتا۔ اردو قاری کے حوالے سے ایسے ہی ایک نکتے کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ وہ یہ کہ اس خطۂ ارض (غیر منقسم بنگال) میں مسلمانوں یا عربی اور فارسی بولنے والوں کے اختلاط سے بنگلہ ادب میں بڑی تبدیلی آئی۔ اس کا ذکر مصنف نے غریب اللہ یا سید حمزہ کی کاوشوں اور اسلامی نبی قصہ اور ست پیر پنچالی کے حوالے سے کیا بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ان کی (بنگلہ میں اسلامی عقائد کی شاعری) اہمیت اس اعتبار سے ہے کہ اس میں دو اہم مذہبی فرقوں کا اہم ملاپ ہوا ہے" تاہم اس باب کو وہاب اشرفی نے ذرا عجلت میں سمیٹ لیا ہے کہ یہ صرف دو فرقوں کے فکری ملاپ کی تاریخ نہیں بلکہ ایک نئی زبان کی پرورش اور اس کی مقبولیت کے نتیجے میں عربی سے بنگلہ زبان کی قربت اور پھر اس سے شعوری طور پر دوری برتنے اور سنسکرت سے قریب ہونے یا بنگلہ زبان کی شدھی کرنے کی تحریک کی تاریخ بھی وابستہ ہے۔ بنگلہ زبان میں عربی کے بے شمار الفاظ اور ان کی تقلیبی صورت پر بھی گفتگو ہونی چاہئے تھی۔ عربی فارسی زبانوں سے بنگلہ کی قربت نے ہی بنگال میں "دو بھاشی" اور پوتھی ادب کے لئے راہ ہموار کی تھی۔ اس دور میں بنگلہ زبان کا پوتھی ادب اور دو بھاشی بنگال میں اردو کی تخم ریزی میں معاون ثابت ہوا ہے۔ یہ نکات اس لئے پیش کئے گئے، تا کہ دوسرے ایڈیشن میں ان پر خصوصی توجہ دی جائے۔ تاہم ان نکات کے باوجود اب تک اردو میں بنگلہ زبان کی جو تاریخ ہندوستان میں لکھی گئی ہے، ان میں وہاب اشرفی کی تاریخ مبسوط ہے۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند میں بھی بنگلہ زبان کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ لیکن وہ تاریخ انفرادی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ اس لئے وہاب اشرفی کی تاریخ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ پھر یہ دنیا کی تمام اہم زبانوں کی تاریخ ہے۔ اس لئے اس میں اختصار کا در آنا لازمی بات ہے۔

"تاریخ ادبیاتِ عالم" سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ اردو میں ایسا وقیع کام پہلی بار ہوا ہے۔ اور وہاب اشرفی نے انفرادی طور پر اس کام کو انجام دیا ہے یہ اہم بات ہے۔ اردو زبان میں جب بھی تاریخ کا تصور ابھرتا ہے تو اس کے ساتھ ابن خلدون اور طبری کے نام بھی ذہنوں میں جھلملانے لگتے ہیں کہ لفظ تاریخ کے ساتھ طبری اور ابن خلدون کے نام لازم و ملزوم ہیں۔ ہر چند کہ وہ ادب کی تاریخ لکھنے والے نہیں اور یہ وقیع کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں، جب کہ وہاب اشرفی کا کام اردو زبان میں ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ وہاب اشرفی کا نام عبقری شخصیتوں میں شامل ہو گیا ہے۔ ہم اردو والوں کو وہاب اشرفی نے اس کام کے ذریعہ اپنی اردو زبان پر ناز کرنے کا موقع عنایت کیا ہے۔ ہمیں تو اس مٹی پر بھی ناز ہے۔ جس مٹی نے وہاب اشرفی جیسی شخصیت کو جنم دیا اور اردو زبان کو بڑی زبان کے شانہ بشانہ لا کھڑا کیا۔

جمال اُویسی، محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'': وقیع کارنامہ

پروفیسر وہاب اشرفی کا تنقیدی کارنامہ بہت وقیع ہے۔ انہوں نے تحقیق میں بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کا ثبوت پیش کیا ہے۔ میر اور مثنویات میر، کاشف الحقائق، قطب مشتری ایک تنقیدی جائزہ اور شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری ان کی ایسی کتابیں ہیں جن میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقید بھی اپنے جلوے بکھیرتی نظر آتی ہے۔ ایک امر قابل توجہ ہے کہ ان کے تحقیقی کاموں میں بھی تنقید کی بالادستی رہتی ہے۔ تنقید ان کی رہبر ہے اور ادب کا مطالعہ ان کیلئے سفر میں مختلف پڑاؤ بنانے کا کام کرتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی اُردو کے کل وقتی نقاد ہیں۔ وہ ادب سے عشق کرتے ہیں۔ ادب کے لئے انہوں نے اپنی صحت کو بھی خراب کرلیا۔ مسلسل بیمار رہتے ہیں لیکن ان کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی رہتی ہے کہ ''مباحثہ'' بہر صورت نکلنا چاہئے۔ کچھ ایسے موضوعات جو ان سے چھوٹ گئے تھے اب ان پر بڑی ذمہ داریوں کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔ حال کے دنوں میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی پر ان کے مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ انہوں نے وہ ذمہ داری جو کاشف الحقائق کا مقدمہ لکھتے وقت اٹھائی تھی آج بھی پوری ایمان داری کے ساتھ اس کو نباہ رہے ہیں۔ جس طرح امداد امام اثر کا مرتبہ اُردو تنقید میں وہ حالی سے کم نہیں گردانتے اسی طرح جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کو فیض اور فراق کے مقابلہ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ابھی ان شاعروں پر بہت کام ہونا ہے۔ ان شاعروں کا حق ادا کرنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔

پروفیسر وہاب اشرفی کی ادبی صلاحیتیں کئی سمت میں سفر کرتی ہیں۔ ایک کارنامہ جو انہوں نے برسوں کی سخت محنت کے بعد مکمل کیا ہے وہ تاریخ ادبیات عالم کی سات جلدیں ہیں۔ ان جلدوں کو مکمل کرتے وقت بیچ میں انہیں اکثر ایسا محسوس ہوا کہ شاید یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکے۔ اس عظیم کارنامہ کی ذمہ داری ان کے سر تھی اس لئے مسلسل اس کام میں لگے رہے۔ ساتویں اور آخری جلد کے شائع ہونے کے بعد انہیں اطمینان ہے کہ یہ ادبی ذمہ داری پوری ہوئی۔ ادبی دنیا ان کے اس کارنامہ کو دیکھ کر محو حیرت ہے اور یہ بات تقریباً ہر بڑے ادیب اور نقاد نے قبول کی ہے کہ جس پروجیکٹ کو پروفیسر وہاب اشرفی نے تن تنہا محنت شاقہ سے انجام دیا ہے وہ ادبی ادارے کئی ادیبوں پر مشتمل کمیٹی کے ذریعہ انجام دیتے ہیں۔ پوری ادبی دنیا اس بات پر بھی متفق ہے کہ وہاب اشرفی نے یہ کارنامہ ادبی عشق اور جنون کے نتیجہ میں انجام دیا ہے۔ اگر ہم اُردو ادب کی تاریخ میں نظر دوڑائیں تو اتنا وقیع کام اس سے پہلے کسی ادیب نے پیش نہیں کیا۔ مغربی ادب کے تراجم کی روایت البتہ ہمارے یہاں رہی ہے۔ جمیل جالبی نے مغربی تنقید کی تاریخ

''ارسطو سے ایلیٹ تک'' میں مکمل کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ ادب اردو کی تین جلدیں لکھیں ہیں۔ انہوں نے ایلیٹ کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں بھی چھپوایا ہے۔ نطشے کی کتاب کا ترجمہ ''یوں کہا زرتشت نے'' کے نام سے اُردو میں ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے افلاطون کی کتاب (Republic) کا اردو ترجمہ ''ریاست'' کے نام سے کیا۔ اردو میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجمے کی روایت بھی رہی ہے۔ کنگ لیئر کا ترجمہ مجنوں گورکھپوری نے کیا۔ آتھیلو کا ترجمہ سجاد ظہیر نے کیا۔ ہیملٹ کا ترجمہ فراق گورکھپوری نے اور انٹنی اور کلیوپٹرا کا ترجمہ مشہور جدید نظم نگار شاعر منیب الرحمٰن نے کیا۔ ان تراجم کی روشنی میں شیکسپیئرین ٹریجڈی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے قدیم مغربی تنقید کے نام سے ایک خاص عہد کی تنقید کی تاریخ لکھی۔ پروفیسر وہاب اشرفی کی ایک کتاب بھی اسی نام سے ہے۔ ترجمہ اور استفادہ کی روایت ہمارے یہاں خاصی پرانی ہے اور اس کا نقطۂ آغاز سرسید و حالی کے زمانہ کا ادب کہلائے گا۔ یہاں جس ادبی کارنامہ سے تھوڑی سی بحث مقصود ہے وہ اس روایت کی ترقی یافتہ نیز پیچیدہ شکل ہے۔ اردو کے اساتذہ اور طلباء کے لئے ان ضخیم جلدوں میں اتنا مواد موجود ہے کہ وہ اس کے مطالعہ کے بعد عالمی ادب کے کسی بھی پہلو پر کھل کر بحث کر سکتے ہیں اور روشنی ڈال سکتے ہیں۔ لیکن پروفیسر وہاب اشرفی نے کہیں بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ یہ تاریخ مکمل ہے اور ہر طرح سے پاک ہے۔ تاریخ ادبیات عالم کی پہلی جلد میں پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی جھجھک نہیں کہ میں نے بیشتر انگریزی کتابوں سے ہی استفادہ کیا ہے، میرا یہ مطالعہ ہے کہ مکمل تاریخ ادبیات عالم کسی زبان میں موجود نہیں۔ مختلف انسائیکلو پیڈیا میں مختلف زبانوں کے ادبیات کی کیفیت انتہائی سرسری طور پر بیان کر دی گئی ہے۔''

ان سطور میں وہاب اشرفی نے جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے اسے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔ قاموسی ادب میں اگر ہر بات کی تفصیل میں جایا جائے گا تو اس بات کا خطرہ رہے گا کہ یہ تاریخ نہ ہو کر داستان میں تبدیل ہو جائے گا اور ایک بات کا سرا دوسری بات سے چھوٹ جائے گا۔ تاریخ ادبیات لکھتے وقت مصنف کے پیش نظر ہر زمانہ کا ادب اور اس کے رجحانات رہتے ہیں۔ مصنف ان رجحانات کے تحت پرورش پانے والے نامور شاعروں اور ادیبوں پر اپنی نگاہیں مرکوز رکھتا ہے اور ادبی رجحان کے مبادیات سے بحث کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے فکری اور نظریاتی ادب کا خاکہ نہایت خوبصورتی سے ترتیب پاتا ہے اور خاص زمانہ کا ادب روشن ہو جاتا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے تاریخ ادبیات عالم کی سات جلدوں میں اسی طریقۂ کار سے کام لیا ہے۔ ان کا ایک ہنر یہ بھی ہے کہ وہ بات کو بے جا طول نہ دے کر مجمل انداز سے یوں پیش کرتے ہیں کہ ان کا مقصد بھی ادا ہو جاتا ہے اور کوئی پہلو چھوٹتا بھی نہیں۔ یہ کارنامہ اردو میں اب تک کا سب سے وقیع کارنامہ کہلائے گا۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف، صدر شعبۂ اُردو، بوکارو اسٹیل سٹی کالج، بوکارو

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'': دانشوروں کی نگاہ میں

ہندو پاک میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند افراد ہیں جنہیں بحیثیت نقاد ادبی وقار، مقبولیت اور شہرت حاصل ہے، پروفیسر وہاب اشرفی ان ہی چند ممتاز اور منفرد نقادوں میں ایک ہیں۔ ان کی متعدد حیثیتیں ہیں۔ اعلیٰ تعلیم سے بہرور اور مطالعے کی وسعت اور شدت نیز ہر نئی کتاب تک پہنچنے کی سعی ان کی سرشت بن چکی ہے۔ وہ مشرقی و مغربی ادبی تصورات، خیالات اور شعریات کے سلسلے میں Up to date رہنے کی جو لگن رکھتے ہیں اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اب تک ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

وہاب اشرفی صاحب بنیادی طور پر اکیڈمیشین اور دانشور ہیں۔ ان کی ادبی دلچسپیاں گونا گوں اور متنوع قسم کی ہیں اور ان کا ادبی کینوس بھی بہت وسیع ہے۔ انہوں نے بہت لکھا ہے۔ اس وادی میں بھی سیر کی ہے جہاں کے تصور سے بھی بعضوں کے حوصلے پست ہو سکتے ہیں۔ جو کام اب تک اکیڈمیاں نہیں کر سکیں وہ اکیلے انہوں نے سر انجام دیا ہے۔ قاموسی کتاب ''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' کی سات ضخیم جلدیں اس کی بیّن مثال ہیں۔ وہاب اشرفی صاحب نے نہ صرف دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی تہذیبی اور ادبی روایات کا خاکہ پیش کیا ہے بلکہ ان کے ادبی اور ثقافتی رجحانات و میلانات کے بارے میں تفصیلی معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ انہوں نے مختلف ممالک و اقوام کے معروف و مستند ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی چند نمائندہ متون کے نمونے بھی اردو ترجمے کی صورت میں پیش کیے ہیں۔

عالمی ادبیات کی تاریخ کو پورے طور پر قلم بند کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ فردِ واحد کے لئے اسے احاطۂ تحریر میں لانا تو ایک امرِ محال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہاب اشرفی صاحب کی حوصلہ مندی اور جرأت کی داد دیجئے کہ انہوں نے اسے ممکن کر دکھایا۔ یہ موصوف کا ایسا کارنامہ ہے جس کی پذیرائی تمام ادبی حلقوں سے مسلسل ہو رہی ہے۔ ایسی قاموسی تصنیف اردو کیا دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی معدوم ہیں۔ انگریزی میں بھی ایک جگہ اس طرح کی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ ایسی صورت میں مختلف دبستان کے ادباء، ناقدین، فنکاروں اور دانشوروں نے اس نہایت وسیع اور قابلِ قدر کارنامے پر کھل کر داد دی ہے۔ نقطہ ہائے نظر کے اختلاف کے باوجود ممتاز ناقدوں اور دانشوروں نے وہاب اشرفی کی علمی وسعت، فکری صلابت، نظر کی گہرائی، تنقیدی بصیرت اور قلم کی پختگی کو سراہتے ہوئے ''تاریخ ادبیات عالم'' کی تدوین کے لئے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

وہاب اشرفی کی شاہکار قاموسی تصنیف ''تاریخ ادبیات عالم'' پر کئی اہم لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنی بڑی جچی تلی رائیں دی ہیں۔ ممتاز اور منفرد نقاد و محقق شمس الرحمن فاروقی جن کا دائرۂ تحقیق

کلاسیکی ادبیات سے لے کر جدید ادبیات تک پھیلا ہوا ہے، نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کا جائزہ لیتے ہوئے اس قسم کی عالمی تصنیفات کا تعارف بھی کرایا ہے اور اس پس منظر میں ''تاریخ ادبیات عالم'' کی تفہیم کی ہے۔

بزرگ شاعر و نقاد علی جواد زیدی نے وہاب اشرفی کی وسیع النظری کی داد دیتے ہوئے 'تاریخ ادبیات عالم' کو قابل قدر تصنیف بتایا ہے اور اسے اردو ادب میں ایک مستقل اور پائندہ اضافے سے تعبیر کیا ہے۔

شمیم حنفی نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کی تمام جلدوں کو کتابوں کے عظیم الشان سلسلے سے تعبیر کرتے ہوئے اسے آزاد بصیرت اور جاذب شعور کے ایک وسیع تر شعر نامے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

مشہور مارکسی اور ترقی پسند نقاد پروفیسر قمر رئیس نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کو وقیع اور نادر معلومات کا خزانہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کتاب پروفیسر وہاب اشرفی نے اس غرض سے بھی قلم بند کی ہے کہ اردو زبان کے دریچے ہر سمت کھلیں، تبھی تو ہر اعظم کی تازہ ہوائیں اور اردو زبان کو بوسیدگی سے دور رکھ سکیں گی۔

سید محمد عقیل رضوی ایک معتبر ترقی پسند نقاد ہیں۔ انہوں نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کی سات جلدوں کو اُردو کی سطح پر عالمی ذخیرۂ ادب سے واقفیت کا واحد ذریعہ قرار دیتے ہوئے اسے اردو دنیا کے لئے ایک حوالہ جاتی اور تجزیاتی انسائیکلو پیڈیا کہا ہے۔

مظہر امام یوں تو بنیادی طور پر شاعر ہیں لیکن ان کی تنقیدی دلچسپیاں بھی بے حد اہم ہیں۔ بلکہ اب تو وہ ایک نقاد کی حیثیت سے بھی جانے اور سمجھے جا رہے ہیں۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ وہاب اشرفی نے دنیا کے مختلف ادب کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

عتیق احمد صدیقی ''تاریخ ادبیات عالم'' کو ایک اہم کتاب تصور کرتے ہوئے اس کا اظہار کرتے ہیں کہ اس سے ایک آفاقی تصور پیدا ہوگا جس سے انسانیت کے فروغ میں مدد ملے گی۔

پروفیسر عطا کاکوی نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کو وہاب اشرفی کا ایک وقیع کارنامہ قرار دیتے ہوئے ان کے حوصلے، محبت اور لگن کی داد ان الفاظ میں دی ہے: ''تاریخ ادبیات عالم'' کا کام حقیقتاً ایک بہت بڑا اور اہم کام ہے، ایک تو یہ کہ ایسی کتابیں کم از کم اردو ادب میں معدوم ہیں، ڈھنگ سے اب تک ''تاریخ ادب اردو'' ہی مرتب نہیں کی گئی تو ادبیات عالم کی فکر کون کرے۔ لیکن حوصلہ منداور جرأت رکھنے والے افراد پیدا ہو ہی جاتے ہیں اور وہ اپنے ادب کی کمی محسوس کرکے اسے پورا کرنے کی سعی مستحسن میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر اشرفی ایسے ہی لوگوں میں ہیں۔'' پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کو وہاب اشرفی کا غیر معمولی کارنامہ قرار دیتے ہوئے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ''تاریخ ادبیات عالم'' کی ساری جلدوں سے وہاب اشرفی کے تبحر علمی کے ساتھ عالمی ادب کی جامع فہم اور تقابلی ادبیات کا بھرپور شعور سامنے آتا ہے۔

معاصر نقاد عتیق اللہ کا خیال ہے کہ ''تاریخ ادبیات عالم'' ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کے مطابق جوں جوں وقت گذرتا جائے گا اس کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا پورا ادبی حلقہ اس پروجیکٹ کی تکمیل سے شاداں ہے۔ واضح رہے کہ

پروفیسر وہاب اشرفی نے اس کی تکمیل میں جو محنت کی ہے اس کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ نامساعد حالات کے باوجود ان کا یہ پروجیکٹ تکمیل کے مرحلے سے گزرتا رہا اور اس طرح اب یہ شاہکار عالموں اور طالب علموں کے سامنے ہے۔ اس کتاب کے ایک سرسری مطالعے سے دنیا کے اہم زبانوں کے ادب اور رجحانات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو دوسری زبانوں سے رشتہ نہیں رکھتے، ان کیلئے بھی یہ ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ یہ نہ صرف مختلف ملکوں، قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کی مشترکہ اقدار کی تلاش میں معاون ہے بلکہ مختلف ملکوں اور زبانوں کے ادبی اور ثقافتی رجحانات اور رویوں سے آشنائی کا اب تک اردو میں واحد ذریعہ بھی ہے۔

یہ بات محسوس کی جائے گی کہ اردو پر انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور امریکی ادبیات کا بڑا گہرا اثر رہا ہے۔ خصوصاً حالیہ منظر نامے میں۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے ایسے گوشوں پر تفصیلی توجہ کی ہے لہٰذا اس سے نہ صرف ہم آج کے ادبی شاہکار سے آگاہ ہو جاتے ہیں بلکہ نئے منظر نامے کے ساتھ، نئی تکنیک کے اطلاقی صورتوں سے بھی آشنا ہو جاتے ہیں۔ گویا ''تاریخ ادبیات عالم'' کی صورت میں ایک ایسی کتاب اب ہمارے سامنے ہے جو تادیر حوالے کا کام کرتی رہے گی اور علم و ادب کے عاشقوں کو فیض پہنچاتی رہے گی۔ شمس الرحمن فاروقی نے ''تاریخ ادبیات عالم'' کو ''ہندوستان کے علمی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ'' کہا ہے تو وہ یقیناً حق بجانب ہیں۔ اس کی اہمیت کا اعتراف ہر گوشے سے ہو رہا ہے۔ مختلف ملکوں اور زبانوں کے ادبی و ثقافتی رجحانات اور رویوں سے آشنائی کے لئے اردو میں یہ یقیناً بے نظیر اور بے مثل کتاب ہے اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے حد اہمیت کی حامل بھی۔

''تاریخ ادبیات عالم'' وہاب اشرفی صاحب کی پندرہ بیس برسوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اس شاہکار قاموسی تصنیف کی ہر جلد میں موصوف نے اپنی خاکساری کا اظہار کیا ہے جو یقیناً ان کی عظمت کی دلیل ہے۔ مطالعے کی وسعت، فکری صلابت، تنقیدی بصیرت، نظر کی گہرائی، تحلیل کے طریقۂ کار، موازنے اور مقابلے کی صورتیں نیز عملی تنقید کی کیفیتیں اور قلم کی پختگی سب کچھ تو اس تاریخ میں ملتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گراں قدر سرمایہ اگر اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں آ جائیں تو لازماً اس کا اعتبار بڑھ جائے گا اور دوسرے ادب کے لوگ بھی اسی طرح استفادہ کر سکتے ہیں جس طرح اردو والے کر سکتے ہیں یا کر رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس سلسلے کا آغاز ہو چکا ہے اور ہندی زبان میں ''تاریخ ادبیات عالم'' کی ابتدائی دو جلدوں یعنی جلد اوّل اور دوم کا ترجمہ ''وشو ساہتیہ کا اتیہاس'' کھنڈ پرتھم اور دتیہ کے نام سے کتاب محل، سروجنی نائیڈو مارگ، الہ آباد کے زیر اہتمام شائع بھی ہو چکا ہے۔

پروفیسر اشرفی آج بھی تازہ دم، متحرک اور فعال ہیں اور شعر و ادب میں مسلسل اضافے کر رہے ہیں۔ ان دنوں 'تاریخ ادب اردو' اور خود نوشت 'قصہ بے سمت زندگی کا' لکھنے میں منہمک ہیں۔ ان کی ادارت میں انتہائی معیاری رسالہ ''مباحثہ'' پابندیٔ وقت کے ساتھ نکل رہا ہے۔ اگر موصوف سات جلدوں پر مشتمل صرف ''تاریخ ادبیات عالم'' لکھتے اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہ لکھتے، تب بھی اردو ادب کی تاریخ ہمیشہ انہیں یاد رکھتی۔

حقانی القاسمی، الخلیل میموریل لائبریری، یتیم خانہ کمپلیکس، ارریا

تاریخ، ترابط اور تفاہم

''تاریخ ادبیاتِ عالم'' پر لکھنا آسان ہے کیا؟ یہ تو اس قدر وسیع و بسیط بحر بیکراں ہے کہ اس پر نکلسن، آر جے بری، رضازادہ شفق، شوقی ضیف، حسن زیات، حنا فاخوری، خیر الدین زرکلی، بروکلمان، فلپ ہٹی، براؤن، انا ماری شمل، محمد سلیم الرحمن، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، محمد حنیف، حبیب حق جیسوں کو ہی لکھنے کا حق پہنچتا ہے کہ ادبیات کی اساس اور مبانی و معانی پہ انہی لوگوں کی گہری اور مربوط نظر ہے۔ کہاں تاریخ ادبیات عالم کی کیم وشحیم جلدیں، گنجینہ معارف، خزینہ معلومات اور کہاں میر کے عاشق زار سے زیادہ نحیف و نزار، بے کس، بے تاب و تواں میرا وجود، میری طرح کے نوآموز لوگوں کی بساط ہی کیا ہے کہ اس کتاب کی گہرائی و گیرائی تک رسائی حاصل کر سکیں اور پھر ہم جیسوں کے ساتھ تو معاملہ کچھ یوں بھی ہے:

شوق دل ہم ناتوانوں کا لکھا جاتا ہے کب   اس تلک آ بھی پہنچنے کی اگر طاقت ہوئی

میرے لئے تو کبھی کبھی کسی بھی تخلیق کے 'دو حروف' کا بار اٹھانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر تو اس کتاب میں علوم و معارف، حقائق و دقائق کے وہ پہاڑ پنہاں ہیں کہ میں ہی کیا، ادب کے رستم و سہراب کی ہمت و جرأت بھی جواب دے جائے اور یوں بھی مجھے تھوڑا بہت لفظوں کی قوت اور حرارت کا اندازہ ہے کہ الوہی الفاظ اگر پہاڑ پر اتارے جاتے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ میرے خیال میں انسانی لفظوں میں اتنی قوت تو ضرور ہوگی کہ ہر سینہ ان لفظوں کا بار نہ اٹھا سکے۔

''تاریخ ادبیاتِ عالم'' فرہاد کی طرح خارا شگنی کا ایک مسلسل عمل ہے۔ ادبیاتِ عالم کی کتنی تاریخیں کھنگالی ہوں گی، کتنے مصادر، موارد، منابع سے رجوع کیا ہوگا تب جا کر یہ کتاب تیار ہوئی ہوگی۔ کئی جلدوں پر محیط کتاب لکھنا تو خیر بہت بڑی بات ہے۔ کبھی کبھی ایک لفظ یا ایک جملے کی تشکیل میں کئی دن اور کئی راتوں کا قافلہ گزر جاتا ہے مگر منزل نہیں ملتی۔ اس ایک لفظ کی اہمیت سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جن کا لفظ و معنی سے گہرا رشتہ ہے۔ کچھ لوگ ''تاریخ ادبیات'' کو ترجماتی عمل کہہ کر اس کی تخفیف و تقلیل کر سکتے ہیں۔ مگر آج کے عہد میں ترجمے اور تخلیص کی زحمت بھی کون گوارا کرتا ہے اور کون دوسروں کو فیض پہنچانے کے لئے اپنے جگر کو لہو کرتا ہے۔ ہمیں تو اتنا پتہ ہے کہ ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' کے ذریعے وہ دریچے وا ہو گئے ہیں جن کے بند ہونے سے ہمارے ذہن تنگ اور محبوس گلیوں میں محصور ہو جاتے۔ ادبیات دیگر اس سے آگہی کے بغیر نہ اظہار میں توانائی آتی ہے اور نہ افکار میں قوت۔ تاب و توانائی کے لئے دنیا کی ادبیات سے آگہی نہایت ضروری ہے۔ سنجیدگی سے دیکھا جائے تو خود اپنی شعری روایت کی تفہیم کے لئے دوسری ادبیات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذہن کے انشعاب اور فکری نظام کی توسیع کے لئے دوسرے اقوام و ملل کی لسانی اور تہذیبی ثقافتی حسیت کا ادراک لازمی ہے۔ کندی، فارابی، ابن مسکویہ، ابن سینا، یونانی فلسفہ و ادب سے آگاہ نہ ہوتے تو شاید عصری دنیا میں ان کی فکری معنویت اس طور پہ مسلم نہ ہوتی۔ اقبال کو آفاقی شاعر اور ان کی فکر کو جو عالم گیریت حاصل ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انہوں نے حکیمان فرنگ اور صاحب نظر ان کی صحبت سے خرد افروزی کی۔ افلاطون، ارسطو، کانٹ، ہیگل، شوپنہار، نطشے، برگساں، گوئٹے، اسپنوزا، رومی، عطار، شمس تبریز، عراقی، جامی، نظیری، سعدی، غزالی، ابن عربی سے استفادہ کیا۔ مشرق و مغرب کے لالہ زاروں کی سیر کی۔ علامہ اقبال کے اشعار اور ان کے افکار کی تفہیم، ان ارباب نظر کے افکار کی تفہیم کے بغیر ناممکن ہے۔ اس طور پہ اپنی شعری اور تخلیقی روایت سے آگہی کے لئے بھی دوسری زبانوں کے مزاج اور منہاج سے آگہی ناگزیر ہے۔

'تاریخِ ادبیات عالم' تہذیبی، لسانی، ترابط تعامل اور آفاقی افکار و اقدار کے مابین اشتراکات کی تلاش نیز تہذیبی، لسانی انفصال کو وصال میں بدلنے کی عمدہ کوشش ہے۔ اقوام و ملل کے تہذیبی لسانی مزاج کے ادراک سے بین تہذیبی مفاہمت کی راہ آسان ہوتی ہے شکوک واشتباہ کا ازالہ ہوتا ہے اور ادبی افکار و اسالیب کو نئے پیرہن بھی ملتے ہیں۔ یہ نسلی لسانی تخصصات کے مابین ایک نئے امتزاج کی جستجو بھی ہے اور آفاقی ادبی اقدار کی بازیافت کا ایک عمل بھی۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' میں اس آفاقی جہت کی جستجو اور وسیع تر عالمی تناظر میں تاریخ ادبیات کی اہمیت اور معنویت کی تفہیم کیلئے ایڈورڈ سعید کے مضمون The clash of definitions کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے کہ اس سے ثقافت کے استعماری اور یک قطبی تصور سے بھی آگہی ہوگی۔

''تاریخ ادبیات عالم'' میں قبل مسیح سے بیسویں صدی تک کے مختلف ادبیات (مصری، مراٹھی، یونانی، لاطینی، جرمن، امریکی، چینی، سنسکرت، ہندی، بنگالی، تامل، تلگو، فارسی، فرانسیسی، عربی، عبرانی، پالی، پنجابی، پرتگالی اور دیگر ادبیات) کے اساطین وصنادید اور اتجاہات، رجحانات، رویے، مزاج و ماہیت، لسانی فکری، تخلیقی نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ انتہائی اہم اور بڑا کارنامہ ہے اور اسی سے زبان و ادب کی ثروت میں اضافہ ہوتا ہے۔ زبانوں کے ترابط اور توافق سے ہی ذہن ونظر کو وسعت ملتی ہے۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' میں ایک چشم جہاں بیں روشن ہے۔ شکر ہے کہ مصنف نے نرم اور نشیبی علاقوں میں نہ اقامت اختیار کی اور نہ ہی تکاہل اور تساہل سے کام لیا کہ کسل مندوں کو نہ پہاڑ کی چوٹی میں پناہ ملتی ہے اور نہ دشوار گذار سیاہ کنکریوں والے میدان میں۔ اُردو میں یہ بڑا کارنامہ ہے کہ تاریخ ادبیات، نظری، عملی تنقید کی کتاب نہیں ہے جس کی مدت حیات، نظریے کے کمال وزوال پہ منحصر ہوتی ہے۔ یہ ایک غیر متغیر موضوع پر ایسا کام ہے جو طلباء، محققین، متخصصین کے ذہنوں میں برسوں زندہ رہے گا۔ مگر کیا شقاق ونفاق کے اس عہد میں اس اہم قاموسی کام کی صحیح طور پہ ستائش ہو پائے گی؟ کیا اتنے فرخندہ ضمیر اور روشن طبع لوگ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ یہ ظلمت کا دور ہے جہاں ہر روشن چیز بھی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے یا کر دی جاتی ہے۔ ایسے ظلمت زدہ ماحول میں بس ایک دعا روشن ہے جو تنقید کو وہ صراطِ مستقیم دکھا سکتی ہے جس سے لوگ منحرف یا گم گشتہ ہو گئے ہیں۔ یہ محض دعا نہیں، میری نظر میں تنقید کی اساس اور اصل الاصول ہے۔ مولانا حالی 'مقدمہ شعر وشاعری' میں تنقیدی اصول واخلاقیات پر طول طائل بحث کے بجائے فقط یہ دعا اور اس کی تفسیر وتعبیر درج کر دیتے تو کافی ہوتا کہ یہی دعا اصل میں تنقیدی معیار، میزان اور مقیاس ہے۔ تخلیق، تنقید اور تحقیق سے جڑے ہوئے ہر فرد کو اس دعا کا ورد کرنا چاہئے کہ اسی دعا سے ادب کے چہرے پر طلعت، نکہت، درخشانی اور رعنائی کی نمود ہو سکتی ہے۔ وہ دعا یہ ہے:

اللھم طھر قلبی من النفاق و عملی من الریا ولسانی من الکذب وعینی من الخیانۃ فانک تعلم خائنۃ الاعین و ماتخفی الصدور (اے اللہ دل کو نفاق، عمل کو ریا، زبان کو جھوٹ اور آنکھوں کو خیانت سے پاک فرما، کیوں کہ آنکھوں کی خیانت اور دل کی پوشیدہ باتوں کو خوب جانتا ہے۔) دل کے نفاق، زبان کے جھوٹ اور آنکھوں کی خیانت نے ہی ہمارے عہد کی تخلیق وتنقید کے بیشتر حصہ کو غیر معتبر بنا دیا ہے۔ کیوں کہ ادیب/نقاد کے لئے صدق مقال، دیانت اور درایت بہت ضروری ہے۔ اسی لئے ہر ادیب کو تخلیق سے قبل اور ہر ناقد کو تنقید سے پہلے یہ دعا ضرور پڑھنی چاہئے کہ اسی دعاء کے ذریعہ ادب کو Detoxify کیا جا سکتا ہے۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' پروفیسر وہاب (اشرفی) کے بحرِ ذخار کا محض ایک عباب ہے کہ ان کے تخلیقی دروں میں تو ہزاروں موجیں مضطرب ہیں اور ہر اضطراب کو اعتبار حاصل ہے۔

''تاریخ ادبیات عالم'' آنکھوں کی خیانت سے محفوظ رہ گئی تو یقیناً مستقبل بعید میں بھی اسے مرجع و مآب کی حیثیت حاصل ہوگی!

پروفیسر ایم اے ضیاء، شعبۂ اُردو، گیا کالج گیا

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' ایک نادر تحفہ

سمندروں کو کھنگالنے کا
جنون جس نے / ہے دل میں پالا
اُسے تو موتی ملا ہی ہوگا
مگر یہ کوشش
نحیف لوگوں کے بس کا
ہرگز نہ ہو سکے گا
قلم کے جوہر دکھانے والو
ہزاروں نعرے لگانے والو
جماعتوں کو بنانے والو
ہے حوصلہ تو اُتر کر دیکھو
سمندروں میں ——— وہاب صاحب
بہت مبارک
یہ حوصلہ / سمندروں کو کھنگالنے کا
دلوں کی خواہش نکالنے کا
تمام عالم سمیٹنے کا
تمام عالم کو دیکھنے کا

یہ تاریخِ ادبیاتِ عالم
ہے ایک نادر / حسین تحفہ
کہ جس کے قرضوں میں
اُردو والے / دبے ہوئے ہیں
مگر یہ جذبہ
جو ذہنِ انساں کے دل میں
پیدا کبھی ہوا ہے
تو اُس نے
اپنی ہی شخصیت میں
اک انجمن
کرلیا ہے پیدا
زمانہ ہرگز بھلا نہ پائے
یہ قدر و قیمت گھٹا نہ پائے
ہزار طوفان آتے جاتے
نقوش اس کے مٹا نہ پائے
یقین اس کا مجھے بہت ہے!!

ڈاکٹر قاسم فریدی، قاضی محلہ، اورنگ آباد (بہار)

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' ایک وقیع علمی کارنامہ

پروفیسر وہاب اشرفی اُردو کے ایک بڑے اور ممتاز ناقد ہیں۔ ان کی شخصیت میں غیر معمولی ذہانت، فہم و فراست کے علاوہ سادگی، حق گوئی اور نیک خوئی کا عنصر موجود ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے دوست ہیں مگر اپنے دشمنوں کو بھی دوست بنا لینے کا ہنر جانتے ہیں۔

وہاب اشرفی جدید تر ادبی نظریات کے قائل ہیں اس کے باوجود معاصر نقادوں میں ان کی انفرادیت اور ان کے امتیازات ان کی دوٹوک رایوں، فیصلوں اور تجزیوں کی وجہ سے قائم ہے۔ وہ نئے رجحانات کو چھان پھٹک کر خوش آمدید کہتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک سے بھی تعلق رکھا اور تحریک جدیدیت سے بھی ان کی وابستگی رہی ہے اور اب مابعد جدید رویوں اور مابعد ساختیاتی شعریات ان کے اہم مضامین اور ان کی مشہور و معروف کتاب ''مابعد جدیدیت ممکنات و مضمرات'' کے مطالعے سے ان کے ایک بیدار مغز اور متجسس نوعیت کے نقاد ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے ہر زمانے میں اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھا ہے اور ہر نئی تحریک و رجحان کو لبیک کہا ہے اور اپنی مدلل، مفسر اور واضح گفتگو سے اردو کے سربرآوردہ نقادوں کو بھی متوجہ کیا ہے۔ ''قطب مشتری کا تنقیدی جائزہ'' ان کی طالب علمی کے زمانے کی تصنیف ہے جو اس زمانے میں پسند کی گئی اور آج بھی ترمیم و اضافہ کے بعد اس کا شمار اُردو کی معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ ''قدیم ادبی تنقید'' کی پذیرائی اُردو کے سخت ترین نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد نے کی اور ''شاد اور ان کی نثر نگاری'' پر اُردو کے سخت گیر محقق قاضی عبدالودود کے توصیفی کلمات موجود ہیں۔ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب پروفیسر وہاب اشرفی کے اقبال کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وہ اپنی کوششوں میں منہمک رہے اور قطب مشتری سے تاریخ ادبیات عالم تک ان کی جانفشانی، علمیت، دانشوری، آزاد شعور، بے تعصب بصیرت، جرأت آزما نظر، وسعت مطالعہ، عمیق مشاہدہ، قلندری، درویش صفتی اور نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو رہنے کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

''تاریخ ادبیات عالم'' پروفیسر وہاب اشرفی کا ایک گراں قدر علمی کارنامہ ہے۔ انہوں نے جدید اُردو تنقید کی پہلی قاموسی کتاب ''کاشف الحقائق'' کا بطور خاص مطالعہ کیا ہے اور اس پر محنت سے مقدمہ لکھا ہے۔ جس زمانے میں وہ کاشف الحقائق'' کی ترتیب و تزئین کر رہے تھے، میرے خیال میں اسی زمانے میں ''تاریخ ادبیات عالم'' کا نقشہ اور منصوبہ ان کے ذہن میں تیار ہوا ہوگا۔ ''تاریخ ادبیات عالم'' سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب علمی حقائق و نظریات اور استدلالی طرز بیان کی مظہر ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے اپنی ذاتی رائے، اپنی معلومات، اپنے مطالعے اور غور و فکر کو اس میں نمایاں کیا ہے۔ ان کا یہ بڑا کمال ہے کہ انہوں نے اس کی مختلف جلدوں میں دنیا کے بیشتر ممالک کی کتابوں اور ان کے مصنفین کا ذکر کیا ہے اور ان کی

خدمات پر اپنی دوٹوک رائے دی ہے۔اس کی پہلی جلد میں مصری، اشورہ، عراقی، کیلٹی، تامل، فارسی، ہسپانوی، پالی، فرانسیسی۔یونانی، لاطینی، چینی اور سنسکرت، دوسری جلد میں فارسی، عربی، جرمن، تامل، اسکینڈ نیویائی وغیرہ ممالک کے ہزاروں سال پرانے ادبی سرمایوں کا ذکر موجود ہیں۔تیسری جلد میں اطالوی اور روسی ادب کے ساتھ ڈنمارک اور اسکاٹ لینڈ کے ادب کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔چوتھی جلد میں پنجابی، مراٹھی، بنگالی، پرتگالی، ڈچ اور سوئڈش ادب کے اعلیٰ نمونوں پر سیر حاصل گفتگو ہمارے ادبی ذوق وشوق کو جلاء بخشتی ہے۔اس طرح پانچویں اور چھٹی جلدوں میں ہندوستان کی دیگر زبانوں اور عربی وفارسی زبان سے متعلق مفصل معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اس کی ساتویں جلد اُردو زبان وادب کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

الغرض یہ کہ ''تاریخ ادبیاتِ عالم'' نہ صرف یہ کہ محض معلومات کا خزانہ ہے بلکہ پروفیسر وہاب اشرفی کی علمی استعداد اور عزم وحوصلے کی گواہ بھی۔ہم جانتے ہیں کہ اتنے بڑے کام کو سرانجام دینے کے لئے منصوبہ بند طریقے پر انجمنیں اور کمیٹیاں افراد واشخاص کا انتخاب کرتی ہیں مگر پروفیسر وہاب اشرفی نے تن تنہا یہ وقیع علمی کارنامہ انجام دے کر نہ صرف یہ کہ اُردو ادب بلکہ ادبیات عالم کے اعلیٰ درجے کے ادبی مورخین کی صف میں اپنا مقام محفوظ کرلیا ہے اور اپنی نابغہ اور عبقری شخصیت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

''تاریخِ ادبیاتِ عالم'' کا یہ بھی انتہائی اہم اختصاص ہے کہ صرف انگریزی میں جزوی طور پر اس موضوع پر کام ہوا ہے مگر ہندوستان کی کوئی بھی دوسری زبان ایسی قاموسی کتاب کو دریافت نہیں کرسکی ہے اور یہ فخر اردو زبان کو حاصل ہے اور اس اعتبار سے بھی پروفیسر وہاب اشرفی کا ہماری زبان پر بڑا احسان ہے۔''تاریخ ادبیات عالم'' میں تاریخ جیسی خشکی نہیں ہے بلکہ بیان کی دل کشی اور قلم کی شگفتگی موجود ہے۔یہ اپنے نوع کی پہلی تصنیف ہے جس میں دنیا کی تمام اہم زبانوں اور علاقوں کے ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پروفیسر وہاب اشرفی نے مشرق ومغرب اور ماضی وحال سے استفادہ کرکے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

شاہد حسین لعل پوری، پھلواری شریف، پٹنہ

لال بنام لعل

واقعتاً کوئی شخص وطن کا انتخاب تو خود کر سکتا ہے، مگر آبائی وطن خون کے رشتوں کی طرح زندگی بھر اس کا پیچھا کرتا ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے لوح محفوظ پر محفوظ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ حسن اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاص آبائی وطن سے منسلک ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ حسن اتفاق یہ ہے کہ میرا آبائی وطن لعل پورہ ہے۔ حالاں کہ میری پرورش اور ابتدائی تعلیم میرے نانا حکیم طاہر مرحوم کے ہاں رمضانپور میں ہوئی مگر لعل پورہ میری شخصیت کے ساتھ ہمیشہ جڑا رہا۔ کبھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ تو کبھی صرف لعل کی شکل میں۔ جب پیار عود کر آتا یا کوئی خاص کام لینا ہوتا تو باجی مجھے لعل کہہ کر پکارتیں۔ ''ارے لعل، دو آنے کی چینی لے آ'' ''ارے لعل، ذرا قرشیہ کے لئے لال دھاگا لے آ، دیکھو ریشمی دھاگا لانا'' وغیرہ وغیرہ۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے لال کہتی ہوں جو لالہ کا مخفف ہو اور جو مغربی بھارت اور پاکستان کے علاقوں میں بچوں کیلئے عرف عام میں استعمال ہوتا ہے۔ یہی لفظ للا یا للّہ کی شکل میں ہندی ادب میں شری کرشن کے لئے ان کے بچپن کا خطاب ہے۔ مجھے اُن دنوں یہ سمجھ تو تھی نہیں کہ وہ مجھے لعل کہتی تھیں کہ لالہ سے مخاطب ہوتی تھیں یا لعل پوری کے بجائے صرف لعل پر اکتفا کر لیتی تھیں یا للّہ کے نعم البدل میں صرف لال کہا کرتی تھیں۔ ہندی ادب میں لال بہ معنی بیٹا کے بھی مستعمل ہے۔ ظاہر ہے باجی مجھے بیٹا کے معنی میں تو لال نہیں ہی کہا کرتی ہوں گی۔

میرے ایک بہت ہی مخلص دوست ہیں انیس الرحمٰن اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ انکا عرفی نام ہے لعل بابو۔ اگلا اتفاق دیکھئے کہ میرے زیر نگیں ایک کارندہ (اسٹاف) ہے لعل بابو۔ میرا ایک دوسرا اسٹاف ہے بابو لعل۔ ہمارے پہلے وزیر اعظم تھے جواہر لعل۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے جواہر لعل نہرو کو جواہر لال نہرو میں تبدیل ہوتے بھی دیکھا جو اس بات کی شہادت ہے کہ ہندی میں لعل نہیں سمو سکتا جب کہ اردو نے لال کو اپنے میں جذب کر لیا اور ''سرخ رو'' ہوئی۔

میرے دونوں اسٹاف چوں کہ صرف ہندی جانتے ہیں اس لئے جب میں نے ان سے کہا کہ وہ لال تو دِکھتے نہیں، ہماری طرح کی شبیہہ و رنگ روپ والے ہیں، پھر لال کا کیا مطلب؟ تو کہنے لگے ''سر، ماں باپ نے ایسا ہی نام رکھا ہے۔ کیا کریں؟'' میرے سمجھانے پر کہ وہ لال نہیں لعل ہیں بہت خوش ہوئے: ''واہ! ہمارے ماتا پتا نے بھی کیا سُندر نام رکھا ہے!''

اسی طرح ایک دفعہ بھائی انیس عرف لعل بابو کے پاس محفل جمی تھی۔ شعراء، مصنف، حکیم، انجینئر، طالب علم سبھی تھے۔ یہ خاکسار بھی شامل تھا۔ بھائی انیس کا بڑا لڑکا حسیب الرحمٰن عرف پھول بابو کچھ دور سے ہماری گفتگو سن رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس سے گویا ہوا:

''بڑی اچھی محفل ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ انکی تعریف؟''

پھول بابو: ''میری تو ہمت نہیں ہے کہ میں ان کی تعریف کروں۔ یہ ایک پر ایک نگینہ ہیں ... کی

گفتگو سے آپ کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ کون کیا ہیں!'' تو جناب، پھول بابو نے اس ناچیز کو بھی اپنے نگینوں میں شامل کرلیا۔ پتہ نہیں اسے میری کون سی بات پسند آگئی تھی۔

بہر حال، جناب عالی، اس لمبے دیباچہ کا مقصد آپ کے گوش گذار کرنا تھا کہ میری زندگی میں لعل ہی لعل جڑے ہیں۔ کسی کے لئے نگینہ ہوں تو کسی کے لئے لعل۔ مگر جناب میری اہلیہ کے نزدیک میں لعل تو کیا لال بھی نہیں ہوسکتا۔ یعنی بالکل بے رنگ و بے کیف ہوں۔ ساتھ ہی مجال ہے کہ کبھی بھول سے بھی لال پیلا ہو جاؤں۔ اس طرح لال ہونا تو در کنار، بس بھیگی بلی کی طرح ان کے احکام پر لبیک کہتا جاؤں اسی میں خیر ہے ورنہ وہ لال ہو گئیں تو بس اللہ کی پناہ! ناشتہ، کھانا سب ندارد۔ دفتر سے واپس آؤ تو چائے پر بھی آفت۔

ایک صبح مجھے آفس جانے کی جلدی تھی۔ میں نے انہیں جگانے کی کوشش کی تو فوراً جواب ملا: ''ذرا چین سے سونے بھی نہیں دیتے۔'' میں نے کہا: ''آپ تو کسی چیز کو سیریسلی (seriously) لیتی ہی نہیں۔''

''کیا کہا؟'' انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اُٹھ رہی ہوں نا، زیادہ لال پیلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

چوں کہ دفتر میں آڈٹ چل رہا تھا اس لئے میں نے اس بات کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا مگر اس نوک جھونک کے بعد ہمارے درمیان ایک تناؤ سا آ گیا اور ہم دونوں چپ ہو گئے۔ دیر رات جب لوٹے تو گھر کا ماحول بجھا بجھا سا پایا اور یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ مزاج یار میں ابھی تک کدورت باقی تھی۔ میرا یہ حال کہ رخ زیبا پر نظر کرنے کی جرأت نہیں، بچوں کے ذریعہ پیغام بھیجا کہ بھئی کم از کم چائے تو بھیجیں۔

حکم ہوا کہ: ''پہلے جا کر بازار سے چائے کی پتی لے آئیں! مجھے کوئی زر خرید لونڈی سمجھ رکھا ہے کہ ہر وقت خدمت پر معمور رہوں۔ میں ہی بازار بھی جاؤں کیا؟ کچھ گھر کی بھی خبر ہے؟''

میں نے تو پوری باتیں سن لی تھیں مگر بچے نے دوسری باتیں حذف کر لیں اور کہا: ''پاپا، ممی کہہ رہی ہیں کہ چائے کی پتی لے آیئے۔''

میں نے کہا: ''کچھ روز قبل ہی تو لایا تھا، ختم ہوگئی؟''

بچے نے کہا: ''وہ...... ماموں جان اور خالہ امی آئی تھیں نا۔ زیادہ خرچ ہوگیا ہوگا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ماموں جان ہر پندرہ منٹ، بیس منٹ پر چائے پیتے ہیں۔''

اب مجھے احساس ہوا کہ اوہو! بڑی غلطی ہوئی۔ پہلے مجھے پوچھنا چاہئے تھا کہ بھئی وہ آپ کے برادر اعلیٰ ومکرم آئے تھے، کب رخصت ہوئے؟ انہوں نے بہ حیات وخیر پہنچنے کی خبر کی کہ نہیں؟ اگر نہیں کی ہے تو ذرا ٹیلیفون لگاؤ بھئی۔ تو ممکن تھا کہ وہ لال سے ہری ہو جاتیں۔

میں نے بیٹے سے کہا: ''ارے، رے، وہ تمہاری شیطان کی خالہ آئی تھیں! تم نے بتایا کیوں نہیں؟''

میں نے تو یہ بات بہت دھیمے سے کہی تھی مگر سانپ کی کان، اہلیہ نے سن لیا۔ بس کیا تھا، قیامت آ گئی۔

''لو، بس اور سنو! میری بہن شیطان ہوگئی۔ میرے لوگوں کا یہاں آنا بھی اب انہیں دشوار گذار ہو رہا ہے۔ میری قسمت پھوٹی تھی کہ ایسے شخص کے پلے لگ گئی۔''

اب لاکھ سمجھاؤ کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا مگر وہ کہاں ماننے والی تھیں۔ ''دیکھئے ہمارے بچے شیطانی

کرتے ہیں اور وہ ان کی خالہ ہیں تو شیطان کی خالہ ہوئیں کہ نہیں؟'' میں نے کہا۔

بولیں: ''میں خوب سمجھتی ہوں۔ آپ ہملوگوں کو ایسے ویسے نہ سمجھیں۔ ہمارے ابا بھی جج تھے۔ وہ تو انتقال......'' ''سب جج تھے۔'' میں نے بات کاٹتے ہوئے تصحیح کی۔

''ہاں ہاں، تو کیا کم تھے؟ آپ کیا ہیں؟''

میں نے کہا: ''بھئی وہ تو ابا ہی تھے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی اونچا مقام لیکر آئے تھے۔ ویسے ناچیز بھی کوئی بہت گیا گذرا تو نہیں۔ ذرا مقابلے کی بات کریں۔''

بس جناب، لگا کہ جیسے دکھتی رگ پہ انگلی رکھ دی۔ بھونچال آ گیا۔ وہ غصے سے لال! مجھے کاٹو تو خون نہیں۔ یہ کیا غضب ہو گیا۔ ان کے بھائیوں یا بہنوں کے بارے میں کوئی ایسا ویسا خیال بھی رکھوں یہ میری مجال! اور وہ اسے برداشت کر جائیں ایسا کبھی ہو بھی سکتا تھا بھلا؟ بھڑک کر بولیں:

''بہت قابل بنتے ہیں؟ ذرا اپنی اولاد کو کچھ بنا کر دکھائیں تو جانوں۔ بگڑ رہا ہے آپ کا بیٹا، بتائے دیتی ہوں۔ اور مجھ سے کوئی امید مت رکھئے گا کہ میں اسے سنبھال لوں گی۔''

میں خوف سے لرز اٹھا۔ بچوں کی زندگی داؤں پر لگ گئی۔ بس وہ لمحہ اور آج کا دن۔ مجال ہے کہ وہ اپنے بیٹے سے بھول سے بھی کبھی کہیں کہ جاؤ پڑھو کہ یہی تمہاری میراث اور یہی تمہارا نصب العین ہے۔ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں کچھ دیر خاموش رہا۔ بزرگوں سے سنا تھا کہ خاموشی بہت سے مسائل کا حل ہے۔ یا ایک فریق کا چپ ہو جانا جھگڑا کو ختم کرتا ہے۔ کچھ وقفہ کے بعد بڑے دھیمے لہجہ میں میں نے انھیں سمجھانا چاہا:

''میڈم، کچھ کہیں؟''

''کیا کہئے گا؟ میرے لوگوں کی برائی کیجئے گا اور کیا؟'' روکھا سا جواب ملا۔

''ارے نہیں بھئی،'' میں نے کہا۔ ''دیکھئے، ہمارے بچے ہماری مشترکہ اولادیں ہیں۔ اس میں میرا کیا اور آپ کا کیا۔''

بولیں: ''میں کچھ نہیں جانتی، سنبھالیں اپنی اولاد کو۔''

''اچھا! آپ کچھ نہیں جانتیں؟ تو یہ پیدا کیسے ہو گئے؟'' میں نے ذرا لطف اندوز ہونے کی غرض سے ان کی چٹکی لی۔ اس شرارت کی پشت پر اس خیال کا بھی دخل تھا کہ اگر وہ مائل بہ رنگینی ہو جائیں تو شاید ان کے رخ میں نرمی آ جائے۔ مگر انکا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بولیں: ''غلطی سے شادی ہو گئی تو یہ پیدا بھی ہو گئے۔''

''چلو، بالآخر آپ نے مانا تو سہی کہ یہ آپ کی بھی اولادیں ہیں۔'' میں نے کہا ''مگر غلطی کس کی ہے، آپ کی یا میری؟''

''وہ تو بھائی جان نے میرے لئے آپکا انتخاب کر لیا اس لئے شادی بھی ہو گئی ورنہ آپ کو پوچھتا کون تھا؟'' انہوں نے احسان جتایا۔

میں نے کہا ''پھر آپ نے میری ڈائری کے وہ صفحات کیوں پھاڑ ڈالے جن میں میرے لئے آئے ہوئے رشتوں کے تذکرے تھے؟''

''جایئے جایئے، انہیں میں سے ڈھونڈ کر کوئی دوسری لے آیئے۔ آپ کی ہر وقت خدمت کیا کرے گی آپ کو تو بس مجھ پر الزام لگانے کا کام ہی باقی رہ گیا ہے۔ میں باز آئی۔ میں الگ ہو جاتی ہوں۔'' وہ اس طرح چڑ کر بولیں جیسے کہ رنگے ہاتھوں چوری پکڑی گئی ہو۔ ویسے بھی یہ عورتوں کی نفسیات میں رچی بسی ہے کہ اپنے علاوہ کسی دوسری عورت کو اپنے شوہر کی زندگی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتیں۔ ایک بیوی کے مرتے دوسری کا تصور بھی ان کی نظر میں گناہ ہے۔ ہر عورت اپنے شوہر کو اپنی ذاتی ملکیت تصور کرتی ہے۔ میری بیگم بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ اگر آپ کو سکون کی زندگی درکار ہے تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ لِلّٰہ کسی دوسری عورت کو اپنے تصور میں بھی نہ لایئے۔ کسی دوسری عورت کو نہ اپنا کر آپ اپنی بیوی کو اپنی بنا پائیں یا نہ بنا پائیں مگر کسی دوسری عورت کو اپنا کر اپنی بیوی کو دشمن ضرور بنا لیجئے گا۔ وہ اور زمانہ تھا جب لوگ دو، تین، اور چار شادیاں کر لیتے تھے، اور ان کے غیض وغضب سے بچ جاتے تھے کیوں کہ یہ بیچاریاں محل سرا میں رہا کرتی تھیں اور ان کے ناخدا کہیں بھی داد عیش وطرب دے لیتے تھے۔ آپ نے محلات کی کہانیاں سنی ہوں گی۔ ان بیگمات کی سیاست، ان کی نت نئی شرارتوں کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ اگر نہیں تو واجدہ تبسم کو پڑھ لیجئے۔ آپ یقیناً میرے خیال کی تائید کریں گے اسی طرح ادب میں پڑھا تھا اور پرانی فلموں میں دیکھا تھا کہ عورتیں اپنے شوہروں کی نور نظر بننے کے لئے کیسے کیسے جتن کرتی تھیں مگر یہاں تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ اہلیہ اپنی رو میں الگ ہونے تک کی دھمکی دے گئیں، جس کی تاب میں نہیں لا سکا۔

''تو آپ یہاں تک سوچ سکتی ہیں؟'' میں نے غصہ میں 'لال' ہو کر کہا۔ ''آپ جانتی ہیں ہمارے معاشرے میں کسی شریف عورت کے لئے یہ بڑے شرم کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے الگ رہے؟ اور بچوں پر اس کا کیا اثر ہوگا اس کا کچھ اندازہ ہے آپ کو؟ ذرا عقل کے ناخن لیں۔''

''اب عقل آئی ہے؟'' میری فہمائش کا ذرہ برابر بھی اثر لئے بغیر انہوں نے جواب دیا۔ ''اُس وقت بچوں کا خیال نہیں آیا تھا جب ہم نے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ ہمارے گھر میں رہیے؟''

بس جناب، میں لال سے پیلا ہو گیا۔ اس وقت کو کوسنے لگا جب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ سسرال باشی ہونا مناسب نہیں۔ ہمارے سماج میں گھر جوائی ہونے پر انسان کا تشخص برقرار نہیں رہتا اور اس بات پر عورتیں فخر کرتی ہیں کہ انکا شوہر مردانہ خصوصیات کا حامل ہے اور سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتا۔

مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ بچوں کے مستقبل تک کی فکر نہیں تھی۔ میری یا میرے جذبات کی کیا قدر کرتیں؟ میں تڑپ اٹھا تھا مگر انہیں ذرہ برابر احساس نہیں تھا کہ میرے دل پر کیسی ٹھیس لگ رہی تھی۔ تیر نشانے پر لگتے دیکھ وہ فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ یہاں سے ہمارے رشتوں میں تلخی آ گئی۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں ہی رات گذار لی۔ میں اکیلا پڑا سوچنے لگا کہ آیا میرا فیصلہ غلط تھا؟ یا میرے پیار میں کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی؟ خیالوں کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ میری زندگی کے نشیب و فراز ورق در ورق میرے سامنے آنے لگے۔ بچپن کے بےفکری کے دن، ہر کسی کا مرکز نظر ہونا، نوجوانی کی لاابالیاں، بھگر نہ بر آنے والے خواب، میری والدہ مرحومہ کیلئے میرے والد مرحوم کی محبت، سبھی یکے بادیگرے تصویر کی طرح گذرنے لگے۔ میری والدہ مرحومہ نے نہ جانے میرے والد مرحوم ومغفور کو کیسی محبت دی تھی کہ جب بھی وہ

انہیں یاد آتیں زاروقطار رو پڑتے۔ میری پیدائش کے چند مہینوں بعد ہی میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ابا جان بالکل جواں سال تھے مگر دوسرا نکاح نہیں کیا۔ مجھ بدنصیب کی شکل میں اماں کی محبت ان کی گود میں کھیلتی جو رہتی تھی میں اپنی جوانی میں بھی ابا مرحوم کے بازو پر سر رکھ کر سو جایا کرتا اور ابا گھنٹوں لیٹے رہ جاتے کہ کہیں اس محبت کی نشانی کی نیند نہ کھل جائے۔ برابر فاتحہ کرتے، قرآن پاک کی تلاوت کر کے اماں مرحومہ کو بخشا کرتے اور بارگاہ ایزدی میں رو رو کر ان کی بخشائش کی دعا کرتے۔ مجھے کبھی بھی ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ ایسا باپ، ایسی بیوی، ایسا شوہر ہر کسی کو عطا فرمائے۔ آمین!

یہ دعا نہ جانے اللہ غفور الرحیم کو پسند آئی یا ابا مرحوم جنت سے محبت کی دوربین لگائے دیکھ رہے تھے کہ ان کی پیار بھری آواز آئی: ''بیٹے، میری بانہیں برسوں سے سونی پڑی ہیں، تمہارے لئے تکیہ بننے کو بیتاب ہیں، آ جا میرے لال!''

اس لفظ نے جیسے میری کانوں میں شہد گھول دیا ہو، بیساختہ میری زبان سے نکلا: ''لبیک، ابا میں حاضر ہوں۔''

زبان پر کلمۂ شہادت کا ورد جاری ہو گیا۔ سامنے ایک محل دکھا جو بقعۂ نور ہو رہا تھا، اس کی ساری دیواریں، گنبد، مینار یں، سبھی نہایت ہی صاف و شفاف تھیں اور ان میں سے نورانی شعائیں چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں۔ ان کی روشنی میں رنگ برنگ کے پھول جو اس محل کا احاطہ کئے ہوئے تھے بہت ہی خوشنما نظر آ رہے تھے۔ ان کی خوشبو میرے سارے سراپا کو معطر کئے دے رہی تھیں۔ میں بے تحاشہ اندر داخل ہو گیا۔ حوروں کی جھرمٹ میں ابا جان ایک نہایت ہی نفیس مخملی گاؤ تکیہ کے سہارے ایک تخت پر جس میں جگمگاتے ہوئے زمرد جڑے تھے جلوہ افروز نظر آئے۔ ان کی بغل میں ایک نہایت ہی نازک طبع بھولی سی مرمریں نازنین بیٹھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ میری امی جان ہیں۔ انہوں نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ ہونٹ ہلے، مگر کوئی آواز نہیں نکلی، جیسے کہ فرط محبت سے انکا گلا رندھ گیا ہو۔ اتنے میں ابا جان نے اشارہ کیا کہ ذرا ٹھہرو۔

امی جان نے کہا: ''آج مجھے نہ روکیں، میرا نور نظر آ رہا ہے۔''

ابا جان: ''میرا بھی لخت جگر ہے، مگر ذرا دیکھیں تو ہماری دی ہوئی تربیت کا کتنا پاس رکھا ہے۔''

امی جان: ''دنیا میں تو میرا لاڈلا زندگی بھر امتحان ہی دیتا رہا ہے، اب تو اسے بخش دیجئے۔''

امی جان کی اس محبت نے مقناطیس کی طرح مجھے کھینچ کر ان کی گود میں ڈال دیا۔

''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔'' غیب سے آواز آئی۔

امی جان نے کہا: ''فرشتو! ذرا ادب ملحوظ رہے۔ ہمارا لخت جگر ہے۔ اس کے اعمال نامہ میں میرے اچھے کاموں کا اندراج کر دو، اور اس کے گناہ و قصور میرے اعمال نامہ میں لکھ دو۔''

میں سسکنے لگا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

''پاپا، پاپا، آپ کیوں رو رہے ہیں؟ اٹھئے۔'' بچے کی آواز آئی۔

آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ میرا بیٹا اور بیٹی معصوم سے چہرے لئے سراسیمہ کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں پرنم تھیں اور آنسوؤں کے موتی بس چھلک پڑا چاہتے تھے۔ مگر بیگم صاحبہ دوسرے کمرے میں ہنوز محو خواب تھیں۔

پروفیسر سیّد منظر امام، مدیر 'وقت'، فاطمہ ہاؤس، واسع پور، دھنباد (جھارکھنڈ)

دربھنگا — دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری (تیسری قسط)

(زیرِ تصنیف 'یہ خود نوشت ہی ہے' کا تیسرا باب)

دربھنگا کی یادوں میں بہت ہی خوبصورت یاد آج کے معروف شاعر اور ناقد محمد سالم سے میری پہلی ملاقات ہے، اس ملاقات کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے مگر یہ پہلی ملاقات میری یادوں کی انگشتری میں نگینے کی طرح آج بھی جڑی ہوئی ہے۔ اس روز پہلی بار میں نے لمحوں کو جاوداں بنتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ یقیناً گرمی ہی کی ایک شام تھی تبھی تو ہم تین چار دوست 'امیر منزل' کے صحن میں بیٹھے خوش گپی میں مصروف تھے، سید احمد شمیم تو تھے ہی کہ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے تھے۔ ان دنوں وہ محمد شمیم احمد ہوا کرتے تھے، انتہائی کھلنڈرے، شریر بلکہ بدمعاش۔ ذہین تو وہ ہیں ہی کہ ذہانت انہیں ورثے میں ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہی ایک چیز انہیں وراثت میں ملی ہی ہے۔ اچانک ایک خوب رو نوجوان، سفید شرٹ اور مکھن زین کے پینٹ میں ملبوس 'امیر منزل' کے مین گیٹ سے داخل ہوا۔ ہماری نگاہیں اس کی طرف اُٹھیں۔

مجھے محمد سالم کہتے ہیں۔ میں جناب نبی اختر میونسپل کمشنر کا بیٹا ہوں، مہدولی میرا گھر ہے۔ حسن امام صاحب سے میری رشتہ داری ہے۔ اس وقت میں ایک غرض سے آیا ہوں۔

''بولئے'' اس سے پہلے کہ میرے لب ہلتے، شمیم پوچھ بیٹھا۔

مجھے ابراہیم جلیس کا ناول ''چور بازار'' چاہئے۔ میرے بڑے بھائی ڈاکٹر ظفیرالدین نے بتایا ہے کہ یہ ناول مظہر امام صاحب کی لائبریری میں موجود ہے۔

''مگر بھیا تو کلکتے میں ہیں۔ ان کی اجازت کے بغیر کتاب نہیں دی جاسکتی'' میں اس سے مخاطب ہوا۔ مجھے لگا کہ وہ مایوس ہوگیا ہے، پھر بھی وہ بیٹھا رہا اسی سبز گھاس پر۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بے تکلف بھی ہوگیا۔ محسوس ہوا جیسے برسوں کا ساتھ ہو۔ اسی شام یہ بھی علم ہوا کہ اسے افسانے لکھنے کا شوق ہے۔ سید احمد شمیم نے اپنے خاکے 'محمد سالم: دوست، نقاد اور شاعر' میں اس پہلی ملاقات کا ذکر بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔

''اب اچھی طرح یاد نہیں شاید یہی کوئی ۵۳-۵۲ کا زمانہ تھا کہ محمد سالم سے میری پہلی ملاقات سید منظر امام کے آبائی مکان 'امیر منزل' میں ہوئی۔ سالم کا ذکر آئے اور منظر امام کا تذکرہ نہ ہو کم سے کم میرے لئے ممکن نہیں۔ منظر امام جواُن دنوں سید کم اور خوش منظر زیادہ تھے اپنے ساتھ یاروں کا ایک قافلہ رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ آج کی طرح چتر چالاک بھی نہیں تھے۔ سالم نے مجھے دیکھا تو کڑھ گیا۔ اس کے والد جناب نبی اختر (مرحوم) میونسپل کمشنر تھے اور ساتھ میں خاک روبوں کی ایک فوج رکھتے تھے جن کے حوالے سے سالم ہمیشہ ہما شما کو دھمکایا کرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ سید منظر امام کی شاخ پر چہچہانے والا یہ نیا پرندہ جان عالم کا طوطا ہے اور کہانی بولتا ہے۔''

سالم روز آنے لگا۔ گھنٹوں بیٹھتا، کیرم کھیلتا اور چائے پلانے (کبھی کبھی ناشتہ بھی) قریب کے 'ہوٹل گرین' میں لے جاتا جس کے مالک احمد ناں (مرحوم) موٹے جسم اور بڑی سی توند کے لئے خاصے مشہور تھے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ پہلی بار کسی ہوٹل میں میرا داخلہ سالم کے ساتھ ہوا۔ اس سے قبل شہر کے کسی ہوٹل میں جانا میں بہت معیوب

سمجھتا تھا۔ دراصل یہ احساس دامن گیر تھا کہ اپنا گھر ہوتے ہوئے جہاں اللہ کے فضل سے تمام چیزیں میسر تھیں ہوٹل میں جا کر کھانا پینا اچھی بات نہیں ہے مگر سالم کے ساتھ جو سلسلہ شروع ہوا تو آج بھی 'ہوٹل بازی' سے نجات نہیں ملی ہے۔ تقریباً ہر مہینے ایک دو بار ہوٹل جا کر لنچ یا ڈنر لینا معمول سے ہو گیا ہے۔

سالم کی دوستی کو میں اپنی زندگی کا بیش قیمت سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس کی رفاقت مجھے ایسے چشموں پر لے گئی جسکا پانی شہد سے زیادہ میٹھا اور برف سے زیادہ سرد تھا۔ اس کی ملاقات سے قبل میری زندگی بہت سمٹی ہوئی 'سکڑی ہوئی اور 'امیر منزل' کی چہار دیواری تک محدود تھی۔ سالم کا یہ احسان ہے کہ اُس نے ایک جوئے آہستہ خرام کو راز سرشاری رفتار سے آگاہ کیا۔

اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے کہ مجھے سالم اور شمیم جیسے دوست ملے۔

وہ بے حد حسین دن تھے۔ اس وقت تک بدصورت لمحوں سے ہماری شناسائی بھی تو نہیں ہوئی تھی' پھر ایسا ہوا کہ سالم کو BHEL (Bharat Heavy Electricals Ltd:) میں ملازمت مل گئی اور وہ بھوپال جانے کو تیار ہو گئے۔ اس سے الگ ہونے کا احساس میرے لئے کافی اذیت ناک تھا مگر کیا کرتا کہ ایک 'نیا سورج' اس کا منتظر تھا۔ میں نے 'امیر منزل' کے باہری کمرے میں ایک شاندار الوداعیہ کا اہتمام کیا۔ یہ وہی کمرہ ہے جس کے بارے میں اچار یہ شوکت خلیل نے اپنے خاکے ''قصہ آپ کے مظہر امام اور ہمارے صاحب بھیا کا'' میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

''جب کہ بائیں جانب کا کمرہ جس کے عین بیچ میں ایک بہت بڑی گول میز (ہمیں یقین ہے انگلینڈ کی گول میز کانفرنس والی گول میز بھی اس سے زیادہ بڑی اور شاندار نہیں رہی ہوگی۔)''

اگر چہ شوکت خلیل کے یہ جملے مبالغہ کی حدوں کو چھو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ گول میز صناعی کا ایک خوبصورت نمونہ تھی۔ اسی گول میز پر جس کے چاروں طرف تقریباً درجن بھر کرسیاں لگی ہوئی تھیں' سالم کو عصرانہ دیا گیا اور اسے پرکشش اور پرلزت بنانے میں منجھلی بھابھی محترمہ مبینہ امام کا سب سے بڑا ہاتھ تھا۔ اس موقع پر کئی دوستوں نے اپنے تاثرات بیان کئے۔ شمیم (سید احمد شمیم) بہت اچھا بولے، صدیق (محمد صدیق رونق) نے انگریزی میں تقریر کی جو کم لوگوں کی سمجھ میں آئی۔ تبسم (منظور الحق تبسم)، ضیاء (حسن ضیاء)، شوکت خلیل، کمو بھائی (سید قمر عالم) نے بھی سالم کی جدائی پر اظہار افسوس کیا۔

سالم چلا گیا اور اپنے ساتھ دربھنگا کی رونقیں بھی لے گیا۔ کئی دن بلکہ کئی ہفتے ہم اس کے 'فراق' میں بجھے بجھے سے رہے مگر وقت تو ماں کی مہربان تھپکیوں کی طرح ہے بہت جلد غموں کو سُلا دیتا ہے۔

زندگی حسب معمول دوڑتی رہی۔ شمیم تھے، ضیاء تھے، صدیق اور تبسم تھے۔ کچھ اور نئے احباب بھی آ گئے تھے۔ انہیں دنوں تسلیم بھائی ہماری 'بزم' میں شامل ہوئے۔ تسلیم بھائی جن کا پورا نام محمد تسلیم ہے' ہم لوگوں سے کافی بڑے تھے۔ بال بچوں والے۔ بے حد مخلص اور ہمدرد۔ میرے ساتھ ان کا تعلق ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ گنگی بازار میں ان کا ہوٹل تھا 'بہار ہوٹل' جب تک یہ ہوٹل قائم رہا اسے خزاں کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ شہر اور گاؤں کے ہر طبقے کے لوگ یہاں ضرور آتے۔ ہم لوگوں کی تو ہر شام ہی 'بہار ہوٹل' کی نذر ہونے لگی۔ اگر میں کبھی تنہا ہوٹل چلا جاتا تو وہ مجھ سے پیسے نہیں لیتے تھے۔ میں ضد کرتا مگر وہ پیسے لینے کو رضی نہیں ہوتے تھے۔ جب تک دربھنگا رہا تسلیم بھائی میری زندگی کا ایک حصہ بنے رہے۔ اچھے بُرے لمحوں میں وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔ آج بھی ان کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔

کیا حسین دن تھے وہ/ جب ہوا ہمیشہ
ہری بھری زمین پر چلتی تھی/ اور آسمان پر
چاند/ کبھی نہیں گھٹتا تھا

میں نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور اب کالج میں داخلہ کا سوال تھا۔ اماں اور بڑے بھیا چاہتے تھے کہ میں سی ام کالج، دربھنگا میں داخلہ لوں مگر میں بضد تھا کہ منجھلے بھیا (مظہر امام) کے پاس کلکتہ میں رہ کر پڑھوں گا۔ وہ بچپن سے میرا Ideal تھے، حالاں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں ان کے 'نقش پا' کے ساتھ چلوں۔ کلکتے سے بھیجے گئے ایک خط میں انہوں نے لکھا بھی تھا کہ اگر تمہارا Ideal میں ہوں تو یہ تمہاری زندگی کے لئے بہت خطرناک ہے۔ بہر کیف، میری ضد پوری کی گئی اور میں کلکتہ آ گیا۔ بھیا اُن دنوں سی ام او ہائی اسکول میں اسسٹنٹ ہڈ ماسٹر تھے اور ۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ میں جو ماہنامہ 'معاون' کا دفتر بھی تھا قیام پذیر تھے۔ کلکتے نے مجھے دو بہت پیارے دوست دیئے۔ اُویس احمد دوراں (جو اُن دنوں رسالوں میں نام چھپوانے کے لئے انتہائی بے تاب رہتے تھے) اور انوار احمد عیاں۔ انوار شاعر تو نہیں تھا لیکن تخلص لگا رکھا تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک فرم میں ڈیزائننگ کا کام کرتا تھا (اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے) ہم ہر شام ملتے۔ چورنگی میں 'ان پورنا' نام کا ایک ریستوراں تھا، وہاں بیٹھ کر امرتی اور سموسہ کھاتے اور چائے پیتے۔ پھر ہم دھرم تلہ میدان میں بیٹھ جاتے۔ دوراں غزلیں سناتے، ساتھ میں انوار کے چٹکلے بھی چلتے رہتے۔ اُن دنوں دوراں کی آواز بہت سریلی تھی، اب کیسی ہے بتا نہیں سکتا کہ بہت دنوں سے ہمارے درمیان 'صوت و آواز' کا رشتہ بھی نہیں ہے۔ برسوں کی رفاقت اتنی دوری میں کیسے بدل گئی اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ نہ ہمارے درمیان کوئی اختلاف ہوا، نہ میں نے کبھی ان کی ادبی قامت کو گھٹانے کی کوشش کی، پھر ایسا کیوں ہوا؟ یہ دوراں ہی بتا سکتے ہیں، حالاں کہ انہیں ادبی دنیا سے متعارف کرانے میں میرا بھی کافی اہم رول رہا ہے۔ ممکن ہے وہ اسے تسلیم نہ کریں یوں بھی انہوں نے زندگی اور دنیا دونوں کو ہمیشہ منفی انداز سے دیکھا ہے۔

سن ۶۰ء میں مجاز نوری کے ساتھ مل کر میں نے سہ ماہی 'رفتار نو' کا اجراء کیا تھا جس کے ۵ شمارے تواتر سے شائع ہوئے۔ اس رسالے کو اپنے زمانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ہندو پاک کے مقتدر ادباء و شعراء کا تعاون اسے حاصل تھا۔ اس میں شامل بیشتر نگارشات اس وقت کے انتہائی معروف ادبی ڈائجسٹ مثلاً ''شاہکار'' الہ آباد، ''جائزہ'' کراچی وغیرہ میں منتخب ہوا کرتی تھیں۔ میں نے ''رفتار نو'' کے شمارہ اوّل میں دوراں کی نظم ''حکایت دوراں'' شائع کی جو دراصل ان کا ''تعارف نامہ'' تھی۔ نظم کی ابتداء اس طرح ہوئی تھی۔

دبلا پتلا نازک دوراں — شیشہ جیسا نازک دوراں
غم کی کالی رات کا مارا — اپنے ہی جذبات کا مارا

اور اختتام اس طرح تھا:

پیارِ انساں کا دل میں بسائے — دردِ جہاں سینے میں چھپائے
دوراں ہے یا روحِ دوراں — گریاں، گریاں، خنداں، خنداں
اس کی دنیا اپنی دنیا
اس دنیا میں ساری دنیا

مجھے وہ شام اچھی طرح یاد ہے۔ میں پٹنہ کالج میں بی اے آنرز کا طالب علم تھا اور اقبال ہوسٹل میں رہتا تھا اور وہیں رہ کر ''رفتارِ نو'' ترتیب دیا کرتا تھا۔ رضا نقوی واہی (مشہور شاعر، مزاح نگار و طنز نگار) مجھ سے ملنے تشریف لائے۔ یہ میرے لئے بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میں ان کے نام اور کلام سے بچپن سے واقف تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ استاذی ڈاکٹر اختر اورینوی ان کے گہرے دوست ہیں۔ واہی صاحب کو اچانک کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر میری لکنت میں اور اضافہ ہوگیا۔ میں نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ ہوسٹل کے کمرہ میں اور صوفہ؟ ہے نا حیرت کی بات؟ دراصل یہ بڑا سا صوفہ مجھے شمیم حیدر نے دیا تھا جو مجھ سے کافی سینئر تھے (میں تھرڈ ایئر اُردو آنرز میں تھا اور وہ سکستھ ایئر انگریزی میں) لیکن ہماری دوستی بڑی گہری تھی۔ وہ جب ہوسٹل چھوڑ کر جانے لگے تو اپنا صوفہ انہوں نے میرے روم میں ڈلوادیا۔ شمیم حیدر اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ام۔ اے۔ کرنے کے بعد وہ رانچی کالج میں انگریزی کے استاد ہو گئے تھے، پھر لیبیا چلے گئے اور وہیں صرف چالیس سال کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔

ہاں، تو ذکر واہی صاحب کی آمد کا ہو رہا تھا۔ انہوں نے بیٹھتے ہی ''رفتارِ نو'' کی تعریف شروع کردی۔ ''منظر امام آپ نے اچھا رسالہ نکالا ہے۔ معیار کے اعتبار سے تو بہار سے نکلنے والے تمام جرائد سے بہتر ہے۔ بھئی یہ اُویس احمد دوراں کون ہیں جن کی بڑی خوبصورت نظم آپ نے چھاپی ہے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ دوراں کلکتہ میں رہتے ہیں۔ ڈاک لیبر بورڈ میں ملازم ہیں اور اپنی موجودہ حالت سے قطعی غیر مطمئن ہیں۔ انہوں نے مجھ سے دوراں کا پتہ مانگا جو میں نے دے دیا۔

بعد میں رضا نقوی واہی اور اویس احمد دوراں میں اتنے گہرے مراسم ہوگئے کہ دوراں ہر دوسرے تیسرے مہینے پٹنہ آتے، کئی کئی دن واہی صاحب کے یہاں قیام کرتے۔ انہیں دنوں ڈاکٹر اختر اورینوی سے کہہ کر واہی صاحب نے دوراں کی شاعری پر ایک مضمون لکھوایا جو'شاعر' بمبئی میں ان کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔ یعنی کسی نئے شاعر پر پہلا مضمون اپنے عہد کے ایک مستند اور باوقار ادیب کے قلم سے لکھا جائے یہ کم بڑی بات نہیں تھی۔ 'رفتارِ نو' کے چار شماروں میں دوراں کی نظمیں شائع ہوئیں۔ ان کی نظم 'آمدِ دوست' جو 'رفتارِ نو' کے شمارہ دوم میں طبع ہوئی، کچھ ہی ماہ بعد یہی نظم 'نقوش' لاہور میں چھپی یہ بھی کسی نئے فنکار کے لئے بڑے فخر کی بات تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نظم اختر اورینوی صاحب نے مدیر 'نقوش' محمد طفیل کو بھجوائی تھی۔ محمد طفیل ڈاکٹر اختر اورینوی اور ان کی بیگم شکیلہ اختر سے بے حد قریب تھے۔ اس قربت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سن ۶۱ء میں جب میں بی اے آنرز کے دوسرے سال میں تھا محمد طفیل ہندوستان بطور خاص انہیں دونوں سے ملنے آئے تھے اور اختر اورینوی صاحب کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ پروفیسر (ڈاکٹر) علی اکبر نقوی (پٹنہ کالج میں انگریزی کے استاد، اُردو شعر و ادب پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی، فیض اور جمیل مظہری پر ان کے مضامین جو 'نگار' لکھنؤ میں شائع ہوئے تھے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعد میں امریکہ چلے گئے) نے اپنے بنگلے پر ایک شاندار عشائیہ کا اہتمام کیا تھا جس میں یہ خاکسار بھی موجود تھا۔ محمد طفیل سے میرا تعارف سہیل بھائی (عظیم آبادی) نے کرایا تھا۔ ''یہ منظر امام ہیں۔ 'رفتارِ نو' نکالتے ہیں۔ منظر امام کے چھوٹے بھائی ہیں'' محمد طفیل بڑے اخلاق سے ملے تھے۔ بھیا کی خیریت دریافت کی جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کٹک سے وابستہ تھے۔ میں نے اپنی آٹوگراف بک ان کی طرف بڑھائی تھی، انہوں نے لکھا ''میں پہلی بار بہار آیا ہوں'' نیچے دستخط کیا اور تاریخ درج کی ۱۸ر فروری ۱۹۶۱ء، یہ آٹوگراف بک آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

۲۰۰۳ء کی بات ہے۔ میں دربھنگا میں تھا۔ عطاء الرحمٰن رضوی (شہر کی معروف سماجی شخصیت) کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔ دعوت مجھے بھی تھی۔ میں اپنے داماد ڈاکٹر امام اعظم کے ساتھ تقریب گاہ پہنچا۔ آگے کی صف میں دوراں بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ اسی صف میں بڑے بھیا (حسن امام درد)، ڈاکٹر منصور عمر، پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر عبدالمنان طرزی، پرنسپل عبدالعلیم ہلال، پروفیسر عبدالرشید اور ادریس پرویز (لاء آفیسر، متھلا یونیورسٹی) تشریف فرما تھے۔ میں دوراں کی طرف لپکا اور اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اپنا سرد ہاتھ آگے کر دیا۔ نہ گلے ملے، نہ باتیں کیں، نہ خیریت دریافت کی۔ مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ کھانے کے لئے ہم ساتھ ہی اٹھے مگر وہ کس طرف چلے گئے میں نے دیکھا نہیں۔

یہ میری اُن سے اب تک آخری ملاقات ہے، اگر اسے ملاقات کہا جائے۔

اویس احمد دوراں کے لئے آج بھی میرے دل میں جگہ ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا میں آج بھی معترف ہوں۔ وہ معتبر شاعر بھی ہیں اور قابل اعتنا نثر نگار بھی۔

اب پھر کلکتے کی طرف لوٹتا ہوں۔ ایک ماہ کے اندر ہی اس شہر سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ گھر کی اور گھر سے زیادہ اماں کی یاد پریشان کرنے لگی۔ اس ایک ماہ میں بھیا نے بڑی محبتیں دیں، ہر طرح خیال رکھا۔ کئی یادگار فلمیں دکھائیں۔ بمل رائے کی ''دیوداس'' شانتارام کی 'جھنک جھنک پائل باجے' Cecil B Dimle کی ''The Ten commandments'' اور دنیا کی پہلی سینما اسکوپ فلم 'The Robe' میں نے انہیں کے ساتھ دیکھی۔ کئی بڑے ہوٹل مثلاً The grand اور Firpo's میں لے گئے۔ کلکتہ کے دوسرے معروف ریستوراں جو کھانوں کی الگ الگ خصوصیات کے لئے مشہور تھے جیسے صابر ریزالہ کے لئے، امینیہ بریانی کے لئے، رائل انڈین چاپ اور رومالی روٹی کے لئے، نظام پراٹھے اور کباب کے لئے اس وقت بھی جانے جاتے تھے، ۴۹ برس گذر جانے کے بعد بھی ان کی پہچان برقرار ہے۔ ان سبھی طعام خانوں میں بھیا کے ساتھ کئی بار جانا ہوا۔ انہیں کے ہمراہ کئی ادبی و شعری نشستوں میں شرکت کا موقع ملا۔ مشہور ترقی پسند شاعر پرویز شاہدی سے پہلی ملاقات اسی زمانے میں ہوئی۔ جمیل مظہری (جو بعد میں پٹنہ کالج میں میرے استاد بھی ہوئے) رضا مظہری، محمود طرزی، بجنو دہلوی، احمد سعید ملیح آبادی، سالک لکھنوی، حرمت الاکرام، اشک امرتسری، احسان دربھنگوی، شہزاد منظر، محمود ایوبی وغیرہم کو دیکھنے، سننے اور ملنے کے مواقع ملے۔ شبلی بھائی (علقمہ شبلی) کو میں دربھنگا سے جانتا تھا۔ اُن کی تعلیم و تربیت اُسی شہر میں ہوئی ہے اور آج بھی وہ میرے لئے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ کلکتہ میں ان سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ اسی سفر میں آج کے معروف ناقد ڈاکٹر وہاب اشرفی اور وکیل اختر (مرحوم) سے پہلی ملاقات مسلم انسٹی ٹیوٹ کے گیٹ پر ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں وہاب بھائی کی بذلہ سنج طبیعت کا اندازہ ہو گیا وہ اس طرح کہ بھیا سوٹ اور ٹائی میں تھے۔ خوش شکل تو وہ تھے ہی، خوش لباس بھی تھے مگر انہوں نے جو کوٹ زیب تن کر رکھا تھا اس کی لمبائی زیادہ تھی، احساس تو مجھے بھی تھا مگر زبان ہلانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہاب بھائی مجھے ایک کونے میں لے گئے اور بولے'' آپ کے بھائی صاحب نے جو کوٹ پہنا ہوا ہے اگر تھوڑا سا اور لمبا ہوتا تو شیروانی کے کام بھی آ سکتا تھا'' ظاہر ہے ہنسی تو آنی ہی تھی۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ وہاب بھائی کے مزاج کی یہ شگفتگی ہمیشہ برقرار رہے، ان کی انگلیاں کبھی فگار نہ ہوں، ان کا خامہ کبھی خوں چکاں نہ ہو اور ان کے قہقہے کبھی معدوم نہ ہوں۔

کلکتہ کے صرف ایک ماہ کے قیام نے میرے ذہن کو بہت وسعت دی۔ مجھ پر پُراسرار ستاروں کے کئی دریچے وا کر دیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے دل کو دھڑکنے کی ادا بھی اسی شہر نے سکھائی۔ آج بھی یہ شہر مجھے بہت اپنا لگتا ہے۔

میں دربھنگا لوٹ آیا۔

دوستوں کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ شمیم، ضیاء، صدیق، کمو بھائی، تسلیم بھائی، تبسم اور سالم (وہ جھیٹیوں پر بھوپال سے آیا ہوا تھا) میرے استقبال کو موجود تھے۔ اماں اور بھابھی مجھے دیکھ کر خوش ضرور ہوئیں لیکن میری پڑھائی کو لے کر کافی فکر مند نظر آئیں۔ اب بہار یونیورسٹی میں داخلہ کا وقت بھی نہیں رہا تھا لیکن مجھے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔

دن گذرتے رہے۔ ایک کے بعد ایک، تسبیح کے دانوں کی طرح۔

ایک شام سالم آیا تو اپنے ساتھ کسی 'ناشناسا' کو لے کر آیا۔ گہرا سانولا رنگ، قمیص پاجامے میں ملبوس، آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک، چہرہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز۔ تعارف ہوا ''منظر ان سے ملو یہ مولانا مجاہدالاسلام ہیں، میرے بہنوئی، ماموں کی لڑکی سے شادی ہوئی ہے۔ حال ہی میں دیوبند سے فارغ ہوئے ہیں۔ ہمیشہ اوّل آتے رہے ہیں۔'' میں نے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ خاموش بیٹھے رہے۔ سالم بولتا رہا۔ دوسرے دن سالم پھر ان کو لے کر آ گیا۔ ایسا کئی دن ہوا۔ وہ بیچارے چُپ چُپ رہتے اور اپنے موٹے شیشے سے ٹکر ٹکر ہم لوگوں کو دیکھا کرتے۔ ایک دن تنگ آ کر مجھے سالم سے کہنا پڑا کہ خدارا انہیں لے کر نہ آیا کرو۔ یہ ہمارے 'قبیلے' سے الگ لگتے ہیں۔

اب سوچتا ہوں تو اپنے کئے پر انتہائی ندامت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وہی مجاہدالاسلام تھے جو بعد میں مولانا مجاہدالاسلام قاسمی کے نام سے عالم اسلام میں مشہور ہوئے۔ قاضی امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ و جھارکھنڈ، نائب امیر شریعت و صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ رہے۔ فقہ پر جن کی کتابیں عرب ممالک کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

مجاہدالاسلام صاحب سراپا خلوص تھے۔ پٹنے میں کئی بار ملاقات ہوئی۔ بڑی محبت سے ملتے۔ پھلواری شریف آنے بلکہ وہیں قیام کرنے کو کہتے۔ سن ۷۵ء کی بات ہے کچھ ہی عرصہ قبل بھیا کا تبادلہ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے دور درشن کیندر سرینگر (کشمیر) ہوا تھا۔ مجاہدالاسلام صاحب سے بانکی پور (پٹنہ) میں ملاقات ہوگئی کہنے لگے ''منظر صاحب'' مظہر امام بھائی کے جانے کے بعد پہلی بار یہ احساس ہوا کہ آدمی کی اپنی شخصیت ہی سب کچھ ہے۔ پوسٹ ووسٹ کچھ بھی نہیں ہے۔ جب تک مظہر بھائی پٹنہ ریڈیو اسٹیشن پر رہے میں سمجھتا تھا کہ پروگرام ایگزیکیٹو بہت بڑا پوسٹ ہے۔ ان کی عزت، قدر و منزلت، رکھ رکھاؤ، دوسروں کے لئے احترام دیکھ کر لگتا تھا کہ یہی ریڈیو اسٹیشن کے سربراہ ہیں۔ لیکن اب اسی پوسٹ پر جو صاحب آئے ہیں انہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ پروگرام ایگزیکیٹو بہت چھوٹا اور معمولی عہدہ ہے۔'' ان کے یہ جملے اب بھی کبھی کبھی ذہن کے پردے سے ٹکراتے رہتے ہیں۔

مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ وقت سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن وہ اپنے علم و فضل، غیر معمولی ذہانت اور دینی خدمت کی بنا پر ہمیشہ لوگوں کے دلوں میں زندہ رہیں گے ۔

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے (جاری)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

ایک لہر نئی نئی۔ ۱۶

وہاب اشرفی کی یہ رائے اہم ہے کہ روسی ہیئت پرست ان اولین افراد میں ہیں جنھوں نے ادبی مطالعے کو آزاد بنیاد دینے کی سعی کی اور اسے ایک خودمختار ڈسپلن کے طور پر برتنا چاہا۔ انہیں اس کا شدید احساس تھا کہ کس طرح سیاست، نفسیات، فلسفہ وغیرہ کی آمیزش نے ادبی مطالعے کا قوام بگاڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'ادبیت' کی بجائے لوگ ادباء کی زندگی پر سارا زور صرف کرتے ہیں۔ اس سے ادب کا مطالعہ نہ صرف خام رہتا بلکہ اس کا کوئی واضح نظام نہیں بن پاتا۔ ان کا خیال تھا کہ Criticism سے وابستہ لوگوں نے چھپے ہوئے الفاظ Printed Words of Text یا متن پر توجہ کی لیکن تلاش معنی میں وہ اپنے ذوقی صفات کو بھی بروئے کار لاتے رہے۔ نمو، تفریق اور اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب اشرفی رقمطراز ہیں:

''ہیئت پرست اس پر زور دیتے ہیں کہ ہیئت پرستی نہ تو جمالیات (جمالیاتی احساس) ہے اور نہ ہی یہ کوئی طریق کار بلکہ یہ ادب کا سائنس ہے جس سے ادبی مواد کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ ایسا طریقہ ہمیشہ تفریقی اور مائل بہ ضد ہوگا۔ اس لئے ان کی نگاہ میں ادبی تخلیق کا وجود اس بات پر ہے کہ نظام ہائے حقائق Order of Facts میں وہ ایک دوسرے سے الگ اور مختلف کس طرح ہے اور ان سے اختلاف ہی اس کی پہچان اور حقیقی پہچان ہے۔ پہلے سے موجود ادب سے مختلف ہونا اس بات پر دال ہے کہ اس میں اجنبیت ہوگی۔ یہ ناآشنائی ہی اس کا انفرادی وجود اور امتیاز ثابت کرتی ہے۔''

اس سلسلے میں وہاب اشرفی نے اینے جیفرسن کا حوالہ دیا ہے۔ Anne Jefferson کے الفاظ یہ ہیں:

" The operative concept in this differential specification is defamiliarization or making strange."

وہاب اشرفی نے ہیئت پرستوں کا جائزہ لے کر اصل شئے ہیئت اور تکنیک کو اُجاگر کیا ہے جسے ''ادبیت'' کہا جاتا ہے۔ دراصل ہیئت پرستوں کا ہیئت پر زور رہا ہے۔ یہاں ساسیئر کو سامنے رکھیں تو اس نے ساخت کی بات کی ہے جو مخصوص زبان میں قبل سے موجود رہتی ہے۔ اس کے خیال میں ضد اشیاء کی تفہیم کے لئے جس کی کارکردگی ادب میں ممکن ہے۔ لیکن ''ادبیت'' یا نیا بنانے کے لئے نہیں کیوں کہ ادیب بنے بنائے نظام یا ساخت میں کام کرتا ہے۔

زبان کے ایک سسٹم ''نظام'' پر گفتگو کرتے ہوئے وہاب اشرفی نے کئی دانشوروں کو سامنے رکھا ہے۔ اشیاء کے رشتے اور رابطے کے بارے میں جیکب سن نے Metaphor (استعارہ) اور Metanomy (مجاز مرسل) کے حوالے سے ادبیت کو سامنے رکھ کر بحث کی ہے جن کا اطلاق ساخت پر ہوتا ہے:

"The projection of the principle of equivalence from the axis of selection to the axis of combination."

ڈیوڈ لوج کا کہنا ہے کہ استعارہ دو چیزوں کو برابر کر دیتا ہے۔ حالاں کہ وہ مختلف ہوتی ہیں اور مجاز مرسل کا مدار تلازے پر ہے۔ اسٹراس نے بھی نتیجہ اُخذ کیا ہے کہ یہ دونوں سطحی یا عمیق ساخت پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ اُردو میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اس بحث کا نچوڑ اس طرح پیش کیا ہے:

''اسٹراس نے استعارہ اور مجاز مرسل کے جوڑے کا اطلاق جب پوری انسانی زندگی پر کیا تو اسے نیچر

اور کلچر کا جوڑ نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ نوع انسانی تو نیچرل ہے جب کہ خود انسان کلچرل ہے۔ اس سے یہ اہم نکتہ ابھرا کہ انسان نے کلچر کو جنم دے کر در حقیقت زندگی کو نیچر اور کلچر میں بانٹا ہے۔''

وہاب اشرفی اس یقینی نتیجہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''کہہ سکتے ہیں کہ جسے وزیر آغا نیچر کہہ رہے ہیں وہ عمیق ساخت ہے اور کلچر سطحی ساخت۔ اس لئے کہ اسٹراس زبان سے متعلق ہونے کے باوجود زیادہ گفتگو بشریات یا علم الانسان سے کرتا ہے اور ساسر کلی طور پر زبان کے حوالے سے۔ اس طرح بجا طور پر لیوی اسٹراس، بشریاتی ساخت کا موجد قرار دیا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ علم الانسان میں حقائق اور اعداد و شمار کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ لیکن اسٹراس نے تو چھان بین کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اسٹراس، ساسر کے اثرات قبول کرتے ہوئے کلچر کا اسٹرکچر یا ساخت کی تلاش کرتا ہے۔ اس کے تصور سے انفرادی عناصر کی معنویت ایک پورے نظام کی ساخت پر مبنی ہے۔ یہ ایسا نظام یا سسٹم ہے جو اپنے آپ میں مکمل اور جامع ہے۔''

وہاب اشرفی نے رولاں بارت کو بھی سامنے رکھا ہے۔ جس نے اعلان کیا کہ کلچر اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ ایک زبان ہے۔ اس کا مضمون The death of the author بیحد مشہور ہوا۔ اس میں اس نے دیگر باتوں کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ تحریر ہر آواز کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ تاسیس یعنی Origin کے ہر نقطے کو تباہ کر دیتی ہے۔ تحریر وہ غیر جانبدار، مخلوط اور غیر مستقیم جائے پناہ ہے جہاں ہمارا موضوع قیام پذیر ہوتا ہے۔ وہ ایک نفی کی صورت ہے جہاں لکھنے والوں کی شخصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی مراکز سے وابستہ ہو کر مصنف وہیں سے مواد اخذ کرتا ہے اور اکتساب کرتا ہے۔ لیکن بارت یہ بھی کہتا ہے کہ مصنف اپنے طور پر ادب تخلیق نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ بقول رومن سلڈن:

"In a 1968 essay, Ronald barths put the structuralist vie very powerfully and argued that writers only have the power to mix already existing writings, to reassemble or redeploy them, writers can not use writings to express the selves, but only to draw upon that immense dictionary of language and culture which is always already written."

وہاب اشرفی نے ماہر ساختیاتیوں میں جوناتھن کلر کے افکار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ حالاں کہ بعضوں کا کہنا ہے کہ اس نے فرانسیسی ساختیات کو اینگلو امریکی تنقیدی تصورات سے ہم آہنگ کیا ہے۔ لیکن وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''دراصل کولر، سائیر کے Language اور Parole سے متعلق افکار پر چامسکی کے Competence کے تصور کو فوقیت دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کسی بوطیقا کی اصل ادبی سرمایہ نہیں بلکہ اس کی ترسیل ہے۔ وہ سارا زور اس مسئلے پر صرف کرنا چاہتا ہے کہ ادب پارے کی تفہیم کس طرح ممکن ہے۔ وہ کون سے رواجی ضابطے اور اصول مرتب ہو سکتے ہیں جو ایسی تفہیم میں

رہنمائی کر سکیں۔"

جونا تھن کولر تفہیمی ضابطے کو سائنسی سطح پر متعین دیکھنا چاہتا ہے، متون کی تفہیم کے اصول اور ضابطے کی نشاندہی کرتا ہے اور پڑھنے والے کے طریقہ پر عمل و تجزیے کے نظام کا راستہ ڈھونڈتا ہے۔ ایک طرح سے قاری اور متن کے نظریے کی تشکیل کرتا ہے۔

وہاب اشرفی نے جیرالڈ پرنس (Introdution to the study of the narratee)، رولف گینگ آئسر (The Act of Reading) ہنس رابرٹ جاؤس (Towar and aesthetic of reception) اسٹینلے فش (Self consurning artificts)، روسن ہولنڈ (Readers Reading)، ڈیوڈ بلیچ (Subjective Criticism) جولیا کرسٹیوا (Revolution of the poetic language) وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جن کے مباحث پس ساختیات کے ردعمل کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ ان میں جولیا کرسٹیوا نے نفسی تجزیے پر انحصار کیا ہے۔ وہ دقیق نفسیاتی گرہ کشائیوں کے عمل سے گزرتی ہے۔ وہاب اشرفی نے امتیازی وصف کی نشاندہی اس طرح کی ہے:

> "کرسٹیوا کا خیال ہے کہ شاعری کا منظر سازی کا عمل جنسی ہے۔ اس نقطہ نظر سے وہ ملارمے کی شاعری کا جائزہ لیتی ہے اور اس کی صوتی ساخت میں جنسیات کی کیفیت تلاش کرتی ہے۔ ساختیات کا نفسیات کے پس منظر میں نظریہ سازی کا عمل یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ Jacques Lacair نے زبان اور لاشعور کے کچھ بنیادی سوالات چھیڑے ہیں۔ کرسٹیوا نے Semiotic اور Symbolic کی بحث شعور کے حوالے سے کی تھی۔ لاکاں لاشعور کے تحت Imaginary اور Symbolic کے موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالتا ہے۔ دراصل وہ فرائڈ ہی کی باتیں سائیر کے اثرات کے تحت کرتا ہے اور شعور و لاشعور کے پیچیدہ اور دقیق پہلوؤں کو مشار اور مشور کے حوالے سے حل کرنا چاہتا ہے۔ چوں کہ کرسٹیوا، فرائڈ کی "پدری بالادستی" کو نہیں مانتی اور مردوں کے خود ساختہ اصولوں اور ضابطوں سے برسرِ پیکار تانیثی تنقید کی طرف راجع ہے۔ اس لئے وہ فرائڈ کے تصورات کو لاکاں کی طرح ایک مرکزی نظام کی طرح نہیں دیکھ سکتی۔"

مشار اور مشور کے حوالے سے ساختیات کے تصور کی توسیع Jacaque & Darrida نے کیا ہے۔ وہ ردِ تشکیل یا Deconstruction کا بنیاد گزار رہے۔ اس کی تفہیم کیلئے اس نے Logocentric کے تصور کو سمجھایا ہے اور زبان اور متن کے ساتھ ساتھ Presence کو ماننے پر زور دیا ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ تحریر میں ایسی موجودگی، صنائع اور بدائع کے استعمال سے ضائع ہو جاتی ہے۔ اس طرح Text (متن)، Textuality (متنیت) کو دبا کر تحریر کی منزل میں خود کو نمایاں کر دیتا ہے۔ دریدا کے ردِ تعمیر کے اصول پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب اشرفی رقمطراز ہیں:

> "اس کا خیال ہے کہ معنی کس نشان میں اپنے آپ پوشیدہ نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مشار محض مشور کا ایک حوالہ ہوتا۔ حالاں مشار معدوم تصورِ معنی کا قائم مقام ہے۔ معنی ضد کی پیداوار ضرور ہے لیکن یہ التواء سے بھی دوچار ہے۔ ایسے میں نشان کا کوئی حقیقی معنی نہیں ہو سکتا۔ نتیجے کے طور پر مشار پہ زور دینا ناگزیر ہے، ساتھ ہی ساتھ متنیت (Textuality) پر بھی بجائے اس کے کہ مشور اور معنی پر۔"

دریدا نے اس اصول کو ردتعمیر کے لئے معاون قرار دیا ہے۔ اس کی منطق ہے کہ متن کا مفہوم ہمیشہ غیر متعین ہے۔ اس کے بارے میں حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہاب اشرفی نے وجہ بھی بتائی ہے:

> ''اس لئے بھی کہ مشور کی کارکردگی اور معنی کو معطل کرنے والے عناصر نیز تفریقی صورت کسی بھی متن کو بہت سے حوالوں کے بیچ کھڑا کردے گی۔ اس سے معنی کی استقامت (Stability) کا خطرے میں پڑنا ناگزیر ہوگا۔''

دریدا نے پس ساختیات کے تصور کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔

لوسی این گولڈ مان (Lucien Gold Mann) نے مارکسیت اور ساختیات کے اشتراک سے فکری رویہ پیش کیا تھا اور بین انفرادی ذہنی ساخت کا نظریہ دیا تھا۔ وہاب اشرفی نے مختصراً اس کی وضاحت کی ہے:

> ''مارکسی نقاد گولڈ مان (Gold Mann) نے یہ نقطۂ نظر اپنایا تھا کہ تخلیق شخصی صلاحیتوں کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ Trans-Individual Mental Structure (جس کا تعلق کسی مخصوص گروپ یا طبقے سے ہوتا ہے) سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ عالمی تصورات World Views کی تشکیل ہوتی رہتی ہے۔ پھر سماجی طبقے انہیں مسمار کرتے رہتے ہیں۔ آخری مرحلے میں گولڈ مان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ بنیادی ساخت بہر طور سماجی ساخت ہی ہے۔''

گولڈ مان کے سلسلے میں سلڈن کی رائے ہے:

> "Gold Mannn's writing depended upon a rathir crude model of super structure and base according to which literary structures simply correspond to economic structures."

ہیگل نے تصور کلیت (Totality) پیش کیا تھا:

> "The essence of the whoie is expresses in all its part."

یعنی کل کی اصل اس کے اجزا میں ہوتی ہے۔ اُسے لوئی آلتھیوسے (Lovis Althuser) نے رد کر دیا تھا۔ بقول وہاب اشرفی:

> ''اس کا خیال تھا کہ مارکسی تصوررد ہیگل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ آلتوسے سماجی نظام یا اجتماعیت جیسی اصطلاحیں استعمال نہیں کرتا بلکہ وہ سماجی تشکیل (Social Formation) کی بحث چھیڑتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے سماجی تشکیل ایک لامرکزی ساخت ہے جو کسی اصول کے تابع نہیں۔ نہ تو اس کا کوئی ابتدائی بیج (Originating Seed) ہے اور نہ ہی اس کے اندر کوئی اتحادی صورت (Over Wllunity) ہے۔ لہٰذا اس کی بحث کا مغز یہ ہے کہ طبقات کسی مرکزی دھارے کا نتیجہ نہیں۔ ہر طبقہ اپنے طور پر آزاد اور خودرو ہے۔ یہ مختلف قسم کے متضاد رویوں سے پیدا ہوتا ہے جس پر اقتصادی صورت واقعہ کی اثر انگیزی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ساختیات اور پس ساختیات کی تفہیم کے لئے وہاب اشرفی نے کئی دوسرے نمائندگان کا ذکر کیا ہے۔ پیری مشیرے، ٹیری ایگلٹن، میخائل باختن، پاول میڈوی ذیف، ویلنٹن ولوشینوف بھی پس ساختیات کی نظریہ سازی میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔

وہاب اشرفی نے ساختیات اور پس ساختیات کی ارتقائی صورت کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے ڈسپلن کی تفہیم کے لئے علمی پس منظر کی وضاحت کی ہے اور اس کے متعلقات سے واقف کرانے کے لئے مباحث سے آگاہ کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے بحیثیت تنقید نگار نئی لہر کا ساتھ دیا ہے۔

اسرار اکبر آبادی، آگرہ

دھارمِک گرنتھوں میں بنیادی صداقتیں

(۵) انبیاء و رسل (اوتار): از۔ شری مد بھاگوت مہاپُران۔ (۹۔۲۴۔۵۶)۔ ترجمہ: ''جب بھی نیکیاں کم ہو جاتی ہیں اور گناہ بہت بڑھ جاتے ہیں تو ہری (خدا کا ایک سنسکرت صفاتی نام) جو تمام خداؤں کا خُدا (یعنی حاکم الحاکمین) ہے، وہ یقیناً (رہنمائی کے لئے) ایک جان پیدا کرتا ہے۔'' یہاں اس سے انبیاء و رسل کا مبعوث ہونا ثابت ہے۔

(۶) وَحی۔ الہام۔ اِلقا: ان الفاظ کے لئے ہندوستانی دھرم گرنتھوں میں ایشوروانی، دیو وانی اور آکاش وانی لفظوں کا استعمال ہوا ہے۔ دیگر ثبوت مذکورہ بالا ذیلی عنوان ''صحیفے'' میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ وَحی انبیاء و رسل پر نازل ہوتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق دیگر آسمانی کتب و صحائف کے ساتھ ساتھ ''بھوشیہ پُران'' کے پرتی سَگ پَرو۔ تیسرے کھنڈ کے پانچ تا سولہ نمبر کے اشلوکوں میں بھی ہے۔ اِن اشلوکوں میں ''محمد ﷺ'' کی بجائے ''محامد'' (महामद) لفظ استعمال ہوا ہے۔ ان میں تحریر ہے کہ...... ترجمہ...... ''اسی دوران اپنے پیرووٗں کے ساتھ محمد ﷺ نامی مقدس ملیچھ (غیر آریہ نسل کا) وہاں آئیں گے...... راجہ بھوج اُن سے کہے گا کہ اے ریگستان کے باشندے، شیطان کو شکست دینے والے، معجزوں کے مالک، برائیوں سے پاک وصاف، برحق، باخبر اور خدا کے عشق ومعرفت کی تصویر، تمہیں نمسکار ہے......'' اِس کے ساتھ ساتھ یجروید (۳۱۔۱۸)، رگِ وید۔ (۸۔۶۔۱۰۷۹) میں بھی محمد ﷺ کا ذکر خیر ہے۔ طوالت سے بچنے کے لئے یہاں صرف حوالے دے دئے گئے ہیں۔

(۷) قیامت (پرلے یا مہاوناش): اس کا واضح اور بین ثبوت یہ ہے کہ دھرم گرنتھوں میں تحریر ہے کہ مہادیو شیو (ایک فرشتے کا نام) تانڈو نرت (جلالی رقص) کریں گے۔ اس کے اثر سے تمام بَراہمانڈ (کائنات) فنا ہو جائے گی۔ مہادیو شیو کی جو خیالی تصاویر بنائی گئی ہیں، ان میں ایک تصویر ایسی بھی ہے، جس میں وہ سنکھ (یعنی صُور) پھونک رہے ہیں۔ دُوسری تصویر میں وہ تانڈو نرت کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ اور کائنات کو فنا ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ قیامت پر ایمان ہونے کے لئے یہ ثبوت کافی اور ٹھوس ہیں۔ ایک اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ دھرم گرنتھوں میں پرلے یا مہاوناش جیسے الفاظ موجود ہیں۔ جب الفاظ موجود ہیں تو قیامت کا آنا ضروری ہے۔ اس لوجک (Logic) سے بھی قیامت کا آنا ثابت ہے کہ ہم اپنے چاروں طرف ہر جاندار کو مرتے ہوئے یا فنا

ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اصول معلوم ہوا کہ ہر جاندار کو فنا ہوتا ہے۔ کائنات بھی جاندار ہے۔ اس لئے یہ بھی فنا ہوگی۔ منزلِ فنا سے گذر کر ہی انسان کو منزلِ بقا ملتی ہے۔ سنسکرت کا ایک مشہور دُعائیہ اشلوک ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ''ہمیں تاریکی سے نُور کی طرف لے چلو۔ جھوٹ سے سچائی کی طرف لے چلو اور موت (یعنی فنا) سے بقا (अमरत्व) کی طرف لے چلو۔''

(۸) جنت اور دُوزخ (سورگ اور نرک): ثبوت (الف) از۔ اَتھرویداز(۶۔۱۲۲۔۳)۔ ترجمہ ''تم دونوں شوہر اور بیوی، میرے پاس صف بستہ کھڑے ہو جاؤ۔ وفادار اس جنت کی دُنیا میں پہنچائے جاتے ہیں۔'' نوٹ: یہ جملے بھی فرمانِ خداوندی ہیں۔ اور کسی صحیفے کے ہیں۔ اِن سے وَحی اور صحیفے کی بھی مزید تصدیق ہو جاتی ہے۔ ثبوت (ب) از۔ اَتھروید (۴۔۳۴۔۲)۔ ترجمہ ''پاک کرنے والے کے ذریعہ پاک ہو کر، ایسے جسم کے ساتھ، جس میں ہڈیاں نہیں ہوں گی ((یعنی جسم لطیف) وہ (یعنی حقدارِ جنت) درخشاں اور مُنور ہو کر ''روشنیوں کی دنیا'' میں پہنچتے ہیں۔ اُن کے مسرور جسموں کو آگ نہیں جلاتی ہے۔ جنت کی دنیا میں اُن کے لئے بڑی لذتیں ہیں'' جنت کے ہونے کے ثبوتوں کے بعد دُوزخ کے ہونے کے ثبوت یہ ہیں۔ از۔ شری مَد بھاگوت پُران (۳۔۳۰۔۲۷۔۲۸)۔ ترجمہ ''جسم کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کئے جاتے ہیں۔ اُسے ہاتھیوں سے چِروایا جاتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے گرایا جاتا ہے۔ یا پانی یا گڑھے میں ڈال کر بند کیا جاتا ہے۔ یہ سب سزائیں اور اِسی طرح کی اَندھ تمس (अन्ध तमस) اور رَورَو (रौरव) نامی دُوزخوں (یہ طبقاتِ جہنم ہیں) کی اور بھی بہت سی عقوبتوں اور تکلیفوں کو، عورت ہو یا مرد، اِس روح کو زندگی میں ہونے والے گناہوں کے باعث بھگتنا پڑتی ہیں۔'' ایک اور ثبوت یہ ہے۔ از۔ شری مَد بھاگوت پُران (۳۔۳۰۔۲۵)۔ ترجمہ ''یہاں (یعنی دوزخ میں) اُس کے (یعنی دوزخی کے) جسم کو بھڑکتی ہوئی لکڑیوں کے بیچ میں ڈال کر جلایا جاتا ہے۔ کہیں خود، کہیں دُوسروں کے ذریعہ کاٹ کاٹ کر اِسے (گنہگار کو) اپنا ہی گوشت کھلایا جاتا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ نوٹ: ان اشلوکوں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جنت اور دوزخ میں جسم اور رُوح دونوں ہی کو اعمالِ نیک و بَد کی سزا و جزا ملتی ہے۔ صرف رُوح ہی کو نہیں جیسا کہ کچھ فلسفے اور نظریات بتاتے ہیں۔

مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ صداقتیں خاص طور سے بنیادی صداقتیں (Fundamental Truths) ابتدا ہی سے ہر جگہ یکساں ہیں۔ ناقابل تبدیل ہیں۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح ہندوستانی دھرم گرنتھوں میں بھی یہ موجود ہیں۔ یہاں قرآن پاک کا یہ بیان تحریر کرنا بھی مفید اور معلومات افزا ہے کہ۔ ترجمہ: ''بیشک پہلی اُمتوں کی کتابوں میں قرآن کا مضمون ہے۔'' از۔ (الشعراء۔۱۹۶)

فریدہ لاکھانی فرحؔ،سڈنی (آسٹریلیا)

صحبتِ سخن لازمی ہے

(نفسیات کے آئینے میں اتر کر)

باہمی گفت وشنید اور مفید مشورے ہر انسان کے اسلوب کونکھارنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

یہ بات تو مشہور ہے کہ ہر انسان جس کی صحبت میں رہتا ہے اس جیسا ہو جاتا ہے۔بعض دفعہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ'' آپ کو آپ کے پڑوسی سے پہچانا جاسکتا ہے'' کسی حد تک درست ہے۔

کچھ لوگ زندگی کو حالات کے بہاؤ پر ڈال کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں لیکن اپنے ساتھ کتابوں کو خاطر خواہ دوست بنا لیتے ہیں۔اسی کنارہ کشی میں وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کس اسلوب میں ڈھل رہے ہیں۔ان کا فطری طور پر جو کہ لازم ہے ضرور گفت وشنید کا دل چاہتا ہوگا اور ایسے میں وہ شاید کتابیں پڑھ کر ذہن کے آئینے کی دیوی ہی سے مخاطب رہنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔حالات بدتر ہو جائیں تو دیوانگی چھا جاتی ہے اور انسان دیواروں تک سے باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔جو عام لوگوں پر دوسری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ لاکھ زباں سے کچھ نہ کہیں، ایک ربط آپ کو ایسے سلسلے سے جوڑ دیتا ہے جس کو آپ بدگمانی کہتے ہیں۔یہ سارے Channels اس کی گفت وشنید ہی کے حوالے سے ناپے جاسکتے ہیں اور اس کا پیمانہ یہی ہے کہ ان کو کبھی کبھی ٹسٹ کیا جائے چپکے سے تو صحبت سخن کا پتہ اپنے آپ چل جاتا ہے۔انسان ہمیشہ تعین کے پھیر میں رہتا ہے اور شعور کا در کبھی کبھی چھوڑ دیتا ہے لیکن اُس کے اندر وہ سارے Uncensored Visions موجود ہیں جسے وہ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔البتہ اُس سے لاعلم کبھی کبھی رہنے لگتا ہے۔ایسے شخص کے اندر اگر یہ تضاد اور یہ لائحہ موجود ہے کہ اُسے کسی سے محبت ہے یا نہیں اور یہ کہ اُسے کسی چیز کی حاجت ہے سوائے کھانے پینے کے تو وہ ایک نارمل انسانی زندگی اور اس کے ساتھ رنگ برنگی تقریبات اور گفت وشنید وصحبت آدمی چاہتا ہے اور انسانوں میں رہنا چاہتا ہے جس کسی کو کنارہ کش ہو کر بھی یہ حاجتیں درپیش ہوں تو وہ جلد اُس جگہ کو چھوڑ دے گا جہاں سے خزاں کے اترنے کے آثار نظر آئیں اور اس کی جدوجہد مسلسل اسے اچھے دن ضرور دکھلائے گی۔

چمن کو چھوڑ ہی دے گی خزاں کبھی نہ کبھی　　بہار ہو کے رہے گی عیاں کبھی نہ کبھی

جو اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں وہ دیوانے ضرور کہلاتے ہیں لیکن انہوں نے جنگ

ہارنے کا ارادہ نہیں کیا ہوا ہوتا ہے جو ان کے اندر چل رہی ہوتی ہے۔ کم از کم اس میں دکھ درد محسوس تو کیا جا سکتا ہے جو اُسے کھا رہی ہوتی ہے۔ البتہ شعور اعلیٰ پر کچھ پردے ضرور پڑے ہوتے ہیں جو ماحول کے بدلنے سے آہستہ آہستہ اُس کو روشنی کی طرف گامزن کرنے لگتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کوئی اور جذبہ اس پر غالب آکر اسے مسخ کردے جو تحریک کی شریانوں میں بہہ رہا ہوتا ہے۔ اس وقت کرم خدا کا بھی کچھ اجنبی سا لگتا ہے جیسے آنکھ میں آئے ترس کی طرح آنکھ کو محسوس ہو۔ ہم آپ بھی یہ محسوس کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی اس کے نتائج پر بھی جلد پہنچ جاتے ہیں لیکن مرض دائمی ہو تو دیر تو لگتی ہے کچھ اخذ کرنے میں۔ لکھاریوں کے یہاں گفت و شنید کا سلسلہ جاری ہی رہتا ہے کیوں کہ اُن کا قلم پہلے کان کا استعمال کرتا ہے اور پھر کچھ منہ سے اگلتا ہے۔ لیکن جو صرف بولنا ہی جانتا ہے وہ سنے گا کب اور لکھے گا کب۔ کچھ بولنے والے بھولا بھی کرتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں خوابوں اور ماضی سے لگاؤ رہتا ہے۔ دورِ حاضر میں جہاں دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے اور خاصی مصروف زندگی گذار رہی ہے وہاں اچھوں اچھوں کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ ہاں یاد اگر رہتی ہے تو صحبتِ سخن کہ کسی نہ کسی سے اس کا جی باتیں کرنے کو چاہتا ہے، ایک شعر او کے راحت کا اس سلسلے میں Quote کرنا چاہوں گی کہ

کس حال میں یہ خوابِ سحر چھوڑ کر چلا | کھل کر نہ یاد آئے نہ بھول ہی سکے

یہ میرا عقیدہ ہے کہ ہر دور کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور ہر مکتب فکر کا اپنا مقام ہے۔ لیکن خواہ انسان کسی بھی مکتب فکر کا حامل ہو یا نہ ہو اور جس دور میں بھی اور جیسے ماحول میں بھی وہ پنپ رہا ہو احساس سے عاری نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ ہر انسان ''Man is a slave to the rhythm''

اسے کسی نہ کسی طور پر متحرک تو ہونا ہی ہے اور یا اپنے لئے اپنی بقا کے لئے یا اپنی دوستی کے لئے یا انسانی دکھ درد بانٹنے کے لئے باہمی گفت و شنید اور (مشورے بھی اگر ہو سکے تو) ساتھی کی ضرورت پڑتی ہے زندگی میں۔ اس سے منہ پھیرنا بددیانتی ہے۔ ہم نے کب ایسا کلچر اپنایا ہے کہ جس میں خوشحالی شامل نہ ہو؟ وہ تو پھر ''Culture of denial'' کہلائے گا نا؟ انسان کو ضرور ایک دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے کچھ کہنا سننا ضروری ہے یا کسی کو ساتھی بنانا تا کہ دل کی بات کہہ سکے۔ احمد فراز نے کیا خوب کہا ہے اور کتنے سادے الفاظ میں کہا ہے کہ

اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے | دلوں کی الجھنیں بڑھتی رہیں گی

سید محمود احمد کریمی (ایڈووکیٹ)، دربھنگہ

دردلِ مسلم......

در دلِ مسلم مقام مصطفےٰ است	حرارت قلب مسلم میں مقام مصطفےٰ سے ہے
آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است	ہماری آبرو دنیا میں نام مصطفےٰ سے ہے
(اقبال)	(ترجمان اسرار)

'تمثیل نو' کے شمارہ 18 & 17 میں جناب اندر سنگھ ورما گوگاؤں (ہریانہ) کا مکتوب مکالے کی شکل میں نظر سے گزرا۔ موصوف نے ناقدین اقبال کا دعویٰ پیش کر کے قاری کو دعوت تحریر دی ہے۔ ساتھ ہی ناقدین کے آراء سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اپنی مہر صداقت ثبت کر دی ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ ناقدین حضرات نے اپنے تبحر علمی، اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے باوجود اقبال کی ذات، عقیدہ اور شعری کو نشانہ ہدف بنا کر اپنے بے جا اختلاف اور تعصب کا ثبوت پیش کیا ہے، جو فن تنقید کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہے۔ ایک ناقد کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاعر یا ادیب کی شخصیت، فن اور طرز فکر کا بحیثیت مجموعی گہرا مطالعہ کرے اور تب قلم اٹھائے۔ نیز صاحب فن کی تنقید نگاری میں انتہاپسندی سے اجتناب کرے، بہر حال کردار کشی سے باز رہے!

حقیقت یہ ہے دور جدید میں ایک جماعت ایسے ناقدین کی ہے، جو یقیناً صاحب قلم، ذہین اور روشن خیال ہیں پھر بھی ۔

نیشِ عقرب نے درپے کین است مقتضائے طبیعتش این است کے مصداق

اپنے تنقیدی سیلان میں اہم ترین اور قابل احترام شخصیتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتے ہیں اور ان کے کردار وفن کی دھجیاں اڑا کر اپنے تنقیدی جائزے کی توثیق چاہتے ہیں نیز صاحب فن کی شخصیت کو بھی متنازعہ فیہ بنا کر بساط تنقید پر اپنا لوہا منوانا چاہتے ہیں۔

علامہ اقبال کے متعلق انور شیخ کی کتاب ''فکر اقبال پر ایک تنقیدی نظر'' حقیقتاً جائز اور غیر جانبدارانہ تنقید ہرگز نہیں! موصوف نے علامہ اقبال کے تمام مجموعۂ کلام جو نو (۹) کی تعداد میں ہیں نیز ان کا تحقیقی مقالہ فلسفۂ عجم اور ان کا مطبوعہ انگریزی لکچرس (ے خطبات مدارس) کا کماحقہ، مطالعہ نہیں کیا ہے، اس لئے غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اُن کے فارسی کے کلام عام فہم نہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے لئے زبردست علمی صلاحیت اور روحانی بصیرت درکار ہے۔ سرسری اور سطحی مطالعہ سے ان کی اور اُن کے فن کی گہرائی تک پہنچنا محال ہے۔ اقبال بہر حال ایک انسان تھے اور اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَائِ وَالنِّسیان کے تحت Flawless نہیں۔ بے عیب اور پاک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے!

''اقبال مرزائی یا قادیانی نہیں تھے۔ ۱۹۰۱ء میں مرزا قادیان کے نبوت کے دعویٰ کے بعد اقبال نے ۱۹۰۲ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں درج ذیل شعر پڑھ کر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ۔

اے کہ بعد از نبوّت شُد بہ ہر مفہوم شرک　　بزم را روشن ز نور شمع عرفاں کردہٴ
(اقبال)''

پھر ۱۹۱۴ء میں اقبال نے ایک بیان دیا کہ:

''جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہے، جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔'' اس سے صاف متشرح ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اور کافر سمجھنے کا اقبال کا رویہ ۱۹۳۵ء میں سامنے نہیں آیا بلکہ وہ ۱۹۰۲ء اور ۱۹۱۴ء یعنی ایک تواتر کے ساتھ اس مسئلہ کا سنجیدگی سے نوٹس لے رہے تھے اور اس جماعت کے عقائد کو اسلام کے منافی تصور کرتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں جب مرزا قادیان کی بیعت کا پیغام آیا تو انہوں نے مئی ۱۹۰۲ء کے 'مخزن'' اور ۱۱ رجون کے محمد دین فوق کے پنجۂ فولاد میں ایک نظم شائع کرائی جس میں قادیانی مذہب کے نتائج کا تجزیہ کیا ۔

تو جُدائی پہ جان دیتا ہے　　وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے　　اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے　　اور آنسو بہا رہا ہوں میں

اس میں قادیانیت کی طرف سے مُنافرت، بھائی بھائی میں تفریق اور مرزا قادیان کی طرف سے دوسروں کے لئے موت کی پیشین گوئیوں پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے رویہ کو غیر پیغمبرانہ بتایا گیا ہے۔ اقبال نے ۱۹۱۱ء میں ایک لٹریچر کتابی صورت میں انگریزی میں تحریر کیا جس کا اُردو ترجمہ 'ملّت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' تھا۔ اس کے حوالہ سے علامہ اقبال اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اُردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اُس سے قبل کی تھی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ــــ بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا، بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک کارکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سُنا۔''

وحیدت عشرت، ماخوذ از ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی، اقبال نمبر، جلد اوّل، جنوری تا جون ۱۹۸۸ء، صفحہ ۲۴۸،۲۴۹۔

---

۱۵ رجون ۱۹۳۵ء کو مجھے ایک قادیانی احمدی نے ایک رسالہ دیا جو دراصل مرزا بشیرالدین محمود کا وہ خطبہ جمعہ تھا جو انہوں نے سر محمد اقبال کے بیانات کے خلاف اُنہیں دنوں دیا تھا۔ ۱۶ رجون کی صبح کو دفتر جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ حضرت علامہ اقبال کو وہ رسالہ دکھاتا جاؤں۔ وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے۔ ڈاکٹر اقبال نے فرمایا کہ انجمن خدام الدین کا انگریزی اخبار ''اسلام'' کا آئندہ پرچہ کب چھپے گا؟ میں نے عرض کیا کہ پرچہ پریس میں جا رہا ہے۔ اس پر آپ نے اُسی پرچے کے لئے بیان لکھوایا۔ پھر اُس کی کاٹ چھانٹ میں بہت وقت صرف ہوا۔ اس بیان کے علاوہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مجھے اس چٹھی کی نقل بھی دی جو انہیں دنوں ''Statesman'' اخبار میں شائع

ہوئی تھی تا کہ اُسے بطور مضمون ''اسلام'' میں شائع کر دیا جائے۔

''یادِ ایّام'' خواجہ عبدالوحید، ماخوذ از ملفوظاتِ اقبال، مرتبہ محمود نظامی، صفحہ ۲۱۰

حضرت علامہ اقبال کی ذات گرامی کے متعلق ایک ہیچمدان کا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے، لیکن ایک محبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔

۱۹۳۶ء میں قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ اس لئے کئی ایک تشنگان ہدایت، رہنمائی حاصل کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ آپ کے ارشادات عالیہ کے منتظر ہیں، آپ نے اپنا شہرۂ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا۔ جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں، اور وہ دلائل جو سیاق و سباق کا لحاظ رکھے بغیر، سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کر سکتی تھیں، تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں! اور نوجوانوں کی متوقع بے راہ روی کا مکمل سدِ باب ہو گیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی، چنانچہ انہوں نے ماڈرن ریویو (Modern Review) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی، جس کا جواب حضرت علامہ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی دفع ہو گئے!

پھر مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے، ایل ایل بی امیر جماعت احمدیہ لاہور کا بھی ذکر درمیان میں آیا۔ آخر کار میں نے عرض کیا کہ فریقین کی آراء کو ایک طرف رکھتے ہوئے آپ مسئلہ ختم نبوت کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی گنجائش نہیں رہ جاتی!

''اقبال کے ہاں'' خضر تمیمی، ایم۔اے۔ ایل ایل بی، ملفوظاتِ اقبال، صفحہ ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰ اور ۲۷۱

پھر مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کے استحکام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور آئندہ پہنچائے گی اگر اس کا استیصال نہ کیا گیا۔

عبدالرشید طارق، ایم۔اے۔ ملفوظاتِ اقبال، صفحہ ۲۹۷

کچھ خاندانِ اقبال کے بارے میں:

شیخ عطا محمد اقبال کے بڑے بھائی کچھ عرصہ قادیانیت کے دامِ فریب میں ضرور اسیر رہے مگر علامہ اقبال کی مسلسل صحبت سے بالآخر انہوں نے، ان کے بیٹے مختار احمد اور بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم نے بھی مرزائیت اور احمدیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا ایک ثبوت اُن کی قبروں کا مسلمانوں کے قبرستان میں ہونا اور اُن کی نمازِ جنازہ کا مسلمانوں کی طرف سے پڑھا جانا ہے۔

شیخ عطا محمد کے داماد ڈاکٹر نظیر صوفی لکھتے ہیں:

یہ کہنا کہ علامہ اقبال کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی، سراسر جھوٹ ہے! حضرت

علامہ کے والد، والدہ، چچا، چچی، بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سُنّی مسلمان تھے اور ہیں۔ سوائے علامہ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد کے جو جج میں ترقی کے لئے چودھری محمد ظفر اللہ خاں کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔ حالاں کہ شیخ اعجاز احمد کی اپنی اولاد بھی جو دو بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے، قادیانی نہیں بلکہ خدا کے فضل سے مسلمان ہے!

ماخوذ از ماہنامہ ''شاعر''، اقبال نمبر، صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲

''دو قومی نظریہ اور تقسیم ہند کا تخیل''

''دو قومی نظریہ کی تاریخ دراصل ۱۸۵۹ء سے شروع ہوتی ہے جب کہ سرسید احمد خاں نے اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں جابجا مسلمانوں کا تذکرہ بطور ایک مستقل جداگانہ قوم کے کیا ہے اور پھر انہوں نے اس نظریہ کو روز بروز وسعت دی! جب وائسرے کی کونسل کے ممبر ہوئے تو وہاں بھی اپنی تقریروں میں اسی نظریہ کو پیش کیا۔ لوکل سلف گورنمنٹ (Local Self Government) کے بل (Bill) پر بحث کی، اس میں کہا کہ:

ہندوستان فی نفسہٖ ایک برِ اعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی بکثرت رہتے ہیں۔ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے، جہاں کے ذات پات کے اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط ہوئی ہیں۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر غالب آجائے گی۔ پھر ۱۸۸۸ء میں بدر الدین طیب جی کے ایک بیان کے جواب میں اپنا مفصل بیان شائع کیا اور اس میں کہا کہ:

> ''یہ امر واجب ہو یا ناواجب مگر ایک مسلمان موچی سے لے کر ایک مسلمان رئیس تک اس بات پر راضی نہ ہوگا کہ ہماری حالت ایسی ہو جائے کہ ہم دوسری قوم کے جو ہمارے ساتھ رہتی ہے، حلقۂ غلامی میں آجائیں!''

جنگ یونان وٹر کی ۱۸۹۵ء کے زمانہ میں ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مسلمانوں میں ایک عرصہ دراز سے بلحاظ نسل اور ملک کے ایک قوم ہونے کا اطلاق بہت کم ہو گیا ہے بلکہ صرف مسلمان ہونا قومیت کی علامت ہو گیا ہے اور کلُّ مومن اخوۃ کا خیال تمام مُلک کے مسلمانوں کو ایک قوم بناتا ہے اس لئے وہ ہر مُلک کے مسلمان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں۔''

ان حقائق کی روشنی میں ماننا پڑتا ہے کہ دراصل سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہندوستان میں برطانوی جمہوری طرز حکومت کو مناسب نہیں سمجھا تھا اور دو قومی نظریہ کی وضاحت پیش کی!

۱۹۲۵ء میں مولانا حسرت موہانی نے بھی یہ تجویز پیش کی کہ ہندو اور مسلم ریاستیں الگ الگ قائم کی جائیں اور مرکز میں ان دونوں ریاستوں کی ایک وفاقی حکومت ہو۔

لالہ لاجپت رائے مشہور کانگریسی لیڈر نے بھی ایک اسکیم تیار کی اور اس میں لکھا کہ:

میری اسکیم کے مطابق مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی۔

(۱) پٹھان صوبہ یا مشرقی و مغربی سرحد

(۲) مغربی پنجاب

(۳) سندھ

(۴) مشرقی بنگال

اگر ہندوستان کے کسی اور حصہ میں بھی مسلمانوں کی ٹھوس اکثریت ہو جس سے بہ آسانی ایک صوبہ کی تشکیل ہو سکے تو ان کو اس کی اجازت دینی چاہئے۔ لیکن یہ بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ یہ متحدہ ہند نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی واضح تقسیم ہے۔ اس تجویز کے متعلق ۱۹۴۸ء میں ایک ممتاز کانگریسی پنڈت سندر لال نے کہا تھا کہ جن کی زبان سے پہلے تقسیم کا لفظ نکلا وہ لالہ لاجپت رائے تھے۔

پھر آخر دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں جو قرارداد منظور ہوئی وہ وفاقی طرز حکومت (یعنی Federal form of govt) کی بناء پر تھی اس میں سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دئے جانے اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں آئینی اصلاحات کے نفاذ پر زور تھا۔ یہ قرارداد سر محمد شفیع (پنجاب) نے پیش کی تھی اور ہر پارٹی نے اس کی تائید کی۔ علامہ اقبال بھی مئویدین میں تھے۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ میں مسٹر جناح کے ۱۴ نکات مرتب ہوئے جو تقریباً قرارداد متذکرہ کے مماثل تھے۔

ہندوستان کے حالات کے لحاظ سے حکومت برطانیہ نے لندن میں ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کی۔ کانفرنس کے اولین اجلاس یکم نومبر ۱۹۳۰ء سے پہلے ہی چودھری رحمت علی نے اپنی اسکیم ''پاکستان'' شائع کی۔ ان سب کے بعد دسمبر ۱۹۳۰ء بمقام الہ آباد مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ ہوا اور علامہ اقبال نے خطبۂ صدارت میں آل مسلم پارٹی کانفرنس (دہلی) کی قرارداد کے متعلق کہا کہ:

''میرے نزدیک تو اس کا محرک یہی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبۂ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے، انہیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہر مضمر کی نشو و نما کر سکیں پھر اُن صحیح عناصر سے ایک آہنگ کُل کی تخلیق ہو، اور مجھے یقین ہے کہ لیگ کا یہ اجلاس مسلمانوں کے ان مطالبات کی پُر زور تائید کرے گا جو مذکورہ بالا قرارداد میں بیان کئے گئے ہیں۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں، میری آرزو ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے، ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا چکا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی لیکن اُس نے ان کو اس بناء پر رد کر دیا کہ ''اگر اس تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا تو ایک ریاست معرض وجود میں آجائے گی، جس کا سنبھالنا مشکل ہوگا۔''

''رائٹ آنریبل سری نیواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس غرض سے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ اُن کے ہاتھ آجائے۔''

''میں (اقبال) مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں جتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنی نشو و نما کا موقع ملے، اس لئے کہ اس قسم کے مواقع حاصل ہونا اس وحدتِ قومی کے نظام میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ حاصل ہو۔'' حقیقت یہ ہے کہ مسٹر لیاقت علی خاں نے اپنے خطبہ صدارت میرٹھ ڈویزنل مسلم لیگ کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کہا تھا کہ سب سے پہلے نہرو کمیٹی کے سامنے یہ تجویز آئی تھی کہ پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کو ایک نظامِ حکومت کے ماتحت کر دیا جائے تا کہ مسلم اکثریت ایک جگہ ہو جائے۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اس خیال کو ذرا وضاحت سے بیان کیا۔

بہر حال متذکرہ حوالوں سے صاف طور پر ثابت ہے کہ تقسیم ہند کا تخیل و تصور علامہ اقبال کا نہ تھا۔ ان سے پہلے بھی اس کا صاف صاف اظہار ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال نے گول میز کانفرنس کے زمانہ میں بھی جب کہ رحمت علی اسکیم کا ہر طرف چرچا تھا۔ اس تقسیم کے متعلق کوئی بیان نہیں دیا۔

چودھری رحمت علی کا اولین پمفلٹ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا، جس میں پاکستان کے ایجاد کی وضاحت تھی۔ مسٹر جناح نے بھی اپنی تقریر اجلاس مسلم لیگ منعقدہ دہلی ۱۹۴۳ء میں کہا تھا کہ چند نو جوانوں کو لندن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شمالی ہند کے ایک حصہ کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے ۳۰-۱۹۲۹ء میں لفظ پاکستان گڑھا۔

۱۹۳۵ء میں جب کہ اقبال کے دوست ڈاکٹر ایڈورٹامسن یہ انتظام کر رہے تھے کہ ان کا انتخاب آکسفورڈ یونیورسٹی میں رھوڈس لکچراری پر ہو جائے تو اس وقت اقبال نے کہا تھا کہ میرے خیال میں:

''پاکستان کی اسکیم حکومت برطانیہ کے لئے تباہ کن ہوگی۔''

''ہندو قوم کے لئے تباہ کن ہوگی'' اور

''مسلم قوم کے لئے تباہ کن ہوگی۔''[1]

خطبات مدراس بزبانِ انگریزی الموسوم The Reconstruction of Religions Thoughts in Islam. اُردو ترجمہ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے متعلق اہم اور ضروری معلومات (ماخوذ از ماہنامہ ''شاعر'' اقبال نمبر، صفحہ ۴۲۳، ۴۲۴)

علامہ اقبال کا متجسس ذہن تلاش و جستجو میں ہمہ وقت مصروف رہا۔ ان کے مزاج میں جدت و تحقیق بے پناہ تھی۔ بہ طور خاص اسلامی فلسفہ و فکر، تصوف، فقہ کے مسائل سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ جو کچھ کتابوں میں تھا اس میں نئی باتوں اور نئے مسائل کا اپنے عصر کے تقاضوں کے مطابق حل اور اضافہ چاہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک مکتوب محررہ ۲۷ راگست ۱۹۲۴ء میں امریکہ سے شائع ہوئی۔ ایک انگریزی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں فقہ کے ایک مسئلے کا ذکر و حوالہ دیا ہے اور استفسارات کئے ہیں۔ کتاب کا نام اُردو میں ''مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات'' تحریر کیا ہے اور کتاب سے ایک حوالہ بیان کیا ہے اور انگریزی کتاب کا نام و نشان درج کیا ہے:

---

[1] ایڈورڈ ٹامسن کی کتاب: Enlist India for freedom, page 58 published in London in 1940

ماخوذ از ماہنامہ ''شاعر'' اقبال نمبر ۱۹۸۸ء، صفحات ۳۰۴ سے ۳۰۹ تک۔

Mohammadan Theories of Finance, By : Nicholas P. Aghanides

اس انگریزی کتاب میں ایک جگہ درج ہے کہ:

"As regards the Ijma some Hamlifites and the MU Tazilites held that the Ijma can repeal the Quran and the Sunnah" (Page-91)

علامہ اقبال کے الفاظ میں درج ہے کہ:

''اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماعِ اُمّت نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ مثلاً مدت شیر خوارگی جو نصِ صریح کی روح سے دو سال ہے، کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہ حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفاء اور معتزلیوں کے نزدیک اجماعِ اُمّت یہ اختیار رکھتا ہے، مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟'' (اقبال نامہ، اوّل، ص ۱۳۱)

امریکی مصنف کا ایک فقہی مسئلہ علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا محرک کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر سید سلیمان ندوی کے علاوہ بھی کئی جید علماء سے استفسارات کئے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے انگریزی میں ایک خطبہ تحریر کیا۔ اُس خطبہ کا یہ نام تھا:

The Idea of Ijtihad - In the law of Islam

یہ خطبہ کسی قدر ترمیم و نظر ثانی کے بعد حبیبیہ ہال لاہور میں سر عبدالقادر کی صدارت میں منعقدہ ایک اجلاس میں پڑھایا گیا۔ بعد میں مزید ترمیم و اضافوں کے بعد اِسے اجتہاد فی الاسلام

The Principal of Movement in the structure of Islam

کے عنوان سے خطبات ششم کے طور پر علامہ اقبال نے اپنی کتاب میں شامل کیا۔

مدارس کی مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کی جانب سے اقبال کو اسلام پر لکچرس دینے کی دعوت موصول ہوئی۔ علامہ نے اس دعوت کو قبول کرتے ہوئے انگریزی میں ۶ خطبات تحریر کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اقبال کے خطبات مدراس کی شہرت ہوئی تو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرف سے خطبات دینے کی دعوت موصول ہوئی۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ پہنچے اور ۱۹ر نومبر سے خطبات کا آغاز ہوا۔ چھ خطبات کا مجموعہ ۶ر مئی ۱۹۳۱ء کو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر پروفیسر آر۔ اے۔ نکلسن اور سر مائیکو بٹلر کو پیش کیا گیا۔ اقبال نے تمام خطبات میں آیاتِ قرآنی کے حوالے دیئے ہیں لیکن اصل متن کی جگہ انگریزی ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ یہ خطبات انگریزی میں ہیں، ان کا ترجمہ اُردو میں سید نذیر نیازی نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے عنوان سے کیا۔

علمی حلقوں میں ان انگریزی خطبات کو بے حد پسند کیا گیا۔ اگست ۱۹۳۲ء میں انگلستان کی Aristotelian Society کی جانب سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ لندن آ کر سوسائٹی کے سامنے لکچر دیا جائے۔ اس دعوت نامے کو قبول کرتے ہوئے انہوں نے ستمبر ۱۹۳۲ء میں ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' (Is Religion Possible) کے عنوان سے ایک اور خطبہ تحریر کیا۔ اختتام سال جب تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے

لندن گئے تو مذکورہ سوسائٹی کے اجتماع میں یہ خطبہ پیش کیا۔ انگلستان کے علمی حلقوں میں اس خطبے کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔ بعدہٗ ساتوں خطبات انگلستان میں طبع ہو کر ہندوستان پہنچے!

انگریزی خطبات کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان خطبات کا ترجمہ اُردو۔ پنجابی۔ پشتو۔ ترکی۔ عربی۔ فارسی۔ فرانسیسی اور بنگالی آٹھ زبانوں میں ہو چکا ہے۔ مندرجہ بالا حقائق و محرکات کے تناظر میں ناقدین اقبال کا یہ خیال کہ ان کے انگریزی خطبات فکری ژولیدگی اور ذہنی پراگندی کا مرقع ہیں، کہاں تک صحیح ہے؟ قارئین کرام اس کا فیصلہ کریں گے!

''عبدالرحمٰن ہاشمی کا تحقیقی مقالہ ''شعریات اقبال'' ہے۔ جس میں مصنف نے قارئین کو بار بار ایک ایسے نکتے کی طرف متوجہ کیا ہے، جو اقبال کے فن کے سابقہ مطالعوں میں نمایاں نہیں ہو سکا، اور وہ یہ ہے کہ اقبال کی تشبیہات و استعارات اور علامات کا بڑا حصہ ان کی دینی بصیرت اور مذہبی اعتقادات کی پیداوار ہیں اور اسی لئے اُن کے ہاں مذہبی شعور کے واسطے سے ایک نئی شعری جمالیات وجود میں آئی ہے اس طرح یہ کہ اقبال کا نظریۂ فن و ادب، ان کے تصورِ دین سے عبارت ہے۔

پروفیسر محمد منور کے مجموعہ مضامین Dimensions of Iqbal میں مصنف کے نزدیک جہانِ اقبال، دراصل جہانِ قرآن ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری اور افکار نے عالم عرب کو متاثر کیا ہے اور عرب دانشوروں اور مصنفین کے ہاں اقبال شناسی کا حوصلہ افزا رجحان فروغ پذیر ہے۔ مقالات میں سب سے اچھا مقالہ ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کا ہے۔ ''اقبال پاکستان'' دمشق کے پاکستانی سفارت خانہ کا شائع کردہ ایک تعارفی کتابچہ ہے۔ محمد اقبال سہیل کے کتابچے ''اقبال والامۃ الاسلامیہ'' میں بتایا گیا ہے کہ علامہ نے اپنی عبقریت اور تجزیہ و تحلیل کی غیر معمولی صلاحیت کے سبب نہ صرف امت اسلامیہ کے امراض کی تشخیص کی، بلکہ اس سے نجات کے لئے دوا بھی تجویز کی ہے۔ المسٔولیت الخلقیہ فی فکر الدکتور محمد اقبال میں ڈاکٹر عبدالہادی الفضلی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ علامہ ایک روحانی Moralist ہیں مگر ان کے معیارات اسلامی اور فکر قرآنی سے ماخوذ ہیں۔'' (ماخوذ از ماہنامہ ''شاعر'' اقبال نمبر صفحہ ۱۰۰، ۱۰۱ اور ۱۰۲)

بین الاقوامی شہرت یافتہ عالمِ دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے عربی زبان میں علامہ اقبال کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار اپنی کتاب ''روائع اقبال'' میں کیا، جو اپنی جگہ سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کو عالم عرب میں شرف قبولیت حاصل ہے۔ نیز اس کتاب کا اُردو ترجمہ ''نقوش اقبال'' اُردو داں طبقہ کے لئے ایک اہم تحفہ ہے۔

ناقدین اقبال کے فہم و شعور کی بدقسمتی ہے کہ وہ سب اقبال کے فکر و نظر، جذبۂ ایمانی، بصیرت روحانی اور قرآن پر ان کے عالمانہ عبور کا کما حقہ احاطہ نہ کر سکے اور ؎

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے کہ مصداق غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔

علامہ اقبال کو اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت اور جرمن زبان پر کامل دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے لندن میں اپنے قیام کے دوران چھ ماہ کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ انہوں نے قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کیا، لہٰذا ان کی زبردست خواہش تھی کہ قرآن حکیم کی تعلیم پر اپنے خیالات مفصل طور پر کتابی صورت

میں ظاہر فرمائیں۔

''عمر عزیز کے بہترین لمحے:

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد　　　جل گیا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

اقبال

جناب حفیظ ہوشیار پوری ملفوظات اقبال کے صفحہ ۱۹۹ء میں لکھتے ہیں:۔

ایک روز میں نے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (سابق صدر شعبۂ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن) سے پوچھا کہ آپ اقبال کے فلسفۂ شعر کی توضیح کن الفاظ میں کریں گے۔ انہوں نے جواب دیا:

اقبال قرآن کا شاعر ہے، اور شاعر کا قرآن ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال سے ملا تو خلیفہ صاحب کے اس فقرے کا ذکر کیا۔ آپ بے حد محظوظ ہوئے۔ خلیفہ صاحب کا یہ فقرہ محض ادبی لطیفہ ہی نہیں بلکہ میں اِسے علامہ کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ سمجھتا ہوں!''

اقبال کا کلام قرآنی آیات کے حوالوں سے مزّین ہے۔ ''معارف اقبال'' میں عبدالرحمن طارق پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اس لئے اہم ترین اور مفید ہے کہ اس میں دنیا کی سب سے زیادہ مقدس و اہم کتاب یعنی قرآن مجید کے بہت سے اقتباسات ہیں جو کلام اقبال کی رُوحانی، مذہبی اور تعمیری و افادی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں۔''

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ　　　عشق را ناموس و نام و ننگ دہ

ترجمہ: ''اے مسلمان! اپنے دل پر اللہ کا رنگ چڑھا اور اس طرح عشق حق کو صحیح عزت وعظمت سے سربلند کر۔'' اس شعر میں مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ کی جانب اشارہ ہے۔ **صِبْغَةَ اللّٰهِ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَة** ؕ اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ کے رنگ سے بہتر رنگ اور کیا ہو سکتا ہے؟

پس خُدا برما شریعت ختم کرد　　　بر رسُولؐ ما رسالتؐ ختم کرد

ترجمہ: ''پس خدا نے ہم پر شریعت ختم کردی، اور رسولؐ کریم پر رسالت کا دروازہ بند کر دیا۔''

اُمّت محمدیہ کے ساتھ شریعت کا ختم ہو جانا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اسلام کے بعد اور کوئی دستور شرعی اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ اس نے قرآن مجید میں صریحاً فرمادیا ہے:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ''

آج کے دن میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، اپنی نعمتیں تم پر تمام کردیں اور تمہارے لئے دینِ اسلام پر رضامند ہو گیا۔''

چنانچہ جس طرح شریعت کا خاتمہ ہولیا، اسی طرح ''نبوت'' بھی آنحضرتؐ کی ذات بابرکات پر ہر جہت سے ختم ہو چکی جیسا کہ فرمایا:

''مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط **وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا** ؕ'' محمدؐ تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے۔ البتہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہے اور پیغمبروں کا ختم

کرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے۔ (معارف اقبال، صفحہ:۳۶+۶۸)

گوہر دریائے قرآں سُفتہ ام　　شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام

اقبالؒ

اندر سنگھ ورما کا طویل مکالمہ پڑھنے کے بعد ذہن میں یہ خیال مرتسم ہوا کہ وہ اقبال پر انور شیخ کی غلط اور جارحانہ تنقید کے حامی ہیں اور ان کی تقلید میں جارحانہ طرز تحریر کے حامل ہیں۔

سیّد مظفر شعیب ہاشمی کا افسانہ...... ''اچھا بابا'' پر اُن کا تبصرہ عُریانیت کا نقطۂ عروج ہے، جس میں موصوف نے افسانہ کی ہیروئن کے Pudendum کی تحریری طور پر بے حُرمتی کی ہے اور مفروضہ جنسی اتصال کے Orgasm کو ذہنی تلذذ کے حُصول تک پہنچا کر دم لیا ہے جب کہ درج ذیل شعر ستر زَن کی پردہ پوشی کی فطری حد متعین کرتا ہے ۔

سترِ زَن یا زَوج یا خاکِ لحد　　سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد

(اقبال)

موصوف نے اپنے تبصرے میں تمام مسلم افسانہ نگاروں کو ہدفِ ملامت بنا کر اور گجرات کے مسلم کش فسادات کا ایک خاص مطمحِ نظر کے تحت ذکر کر کے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو ٹھیس پہنچایا ہے۔

بہر حال تحریر وتقریر میں بدکلامی انسانی عظمت ووقار کے منافی ہے ۔

آدمیت احترامِ آدمی　　با خبر شو از مقامِ آدمی

(اقبال)

حسن رہبر، بھاگلپور

گنجائش

اویناش نے جب سے بڑے وزیر کا عہدہ سنبھالا تھا۔ مصروفیات کے ساتھ ان کے مسائل بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ کچھ قریبی رشتے داروں نے بھائی بھتیجے کے لئے پہلے سے ہی کہہ رکھا تھا۔ جان پہچان اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں نے بھی ان کی ذات سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ اپنے میکے والوں کے لئے بیسویں کا دباؤ بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ تنہائی کے خوشگوار لمحوں میں بھی وہ کئی بار اپنے بھائیوں کے لئے ان سے کہہ چکی تھیں۔ مگر مخلوط حکومت کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ مختلف جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنا کوئی آسان کام نہیں۔ بہت ناپ تول کر قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ پھر بھی اپنے ہی خواہوں کے احسان کا بدلہ تو چکانا ہی تھا۔ جس کے لئے انہوں نے پہلے سے ہی جانب داری کے الزام سے بچنے کی ایک تدبیر ڈھونڈ رکھی تھی اور اپنے ایک وزیر دوست کی راہوں کے تنکے چن کر اپنی گزرگاہوں کو آسان بنا لیا تھا۔

مگر ابھی وہ موقع کی تلاش میں ہی تھے کہ ایک مصیبت آ کھڑی ہوئی۔ انہیں وزارت سنبھالے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ ریاست کے ایک بڑے شہر میں فساد پھوٹ پڑا۔ آناً فاناً کئی گاؤں اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ سینکڑوں قیمتی جانیں گئیں۔ لاکھوں کی املاک کا نقصان ہوا۔ مگر حکومت چوکس تھی بروقت کارروائی کر کے حالات کو قابو میں لانے میں کامیاب ہو گئی۔ اویناش بڑے سیکولر ذہن کے مالک تھے۔ ان کی ذات پر سب کو بڑا بھروسہ اور اعتماد تھا۔ جیسے ہی حالات میں سدھار کے آثار نظر آئے۔ انہوں نے مخالف جماعتوں کے مطالبے پر فساد کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی قائم کر دی اور ہائی کورٹ کے ایک سابق جج کو اس کا سربراہ بنا کر ان کی مدد کے لئے اپنے کئی آدمی نامزد کر دئے۔

تفتیش کاروں نے تحقیقات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تحقیقاتی رپورٹ آنے تک خوف کے بادل چھٹ چکے تھے۔ رپورٹ ہر لحاظ سے مکمل، مستند اور غیر جانب دار ثابت ہوئی۔ بڑے وزیر نے کمیٹی کی کارکردگی سے مطمئن ہو کر اس کے قیام کو مستقل حیثیت دے دی اور اس کا دائرۂ اختیار بھی بڑھا دیا۔ جس سے مزید امیدواروں کی بحالی کے راستے ہموار ہو گئے اور بڑے وزیر کا ذہنی تناؤ بھی دور ہو گیا۔

रोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برا...

...motion of Urdu Language

...r Education, Govt. of India

...110 066. Tel: 011-26103938, 26103381, 26179657

...net.in Website: http://www.urducouncil.nic.in

اہلِ وطن کو ...59

جناب ارجن سنگھ
مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

"اردو ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب کی علم بردار زبان ہے اور ملک میں اتحاد، سیکولرزم اور سماجی اقدار کے فروغ میں ا...
خوبیوں کی وجہ سے وہ لوگ بھی اس پر فریفتہ ہیں جو اردو نہیں جانتے۔ وزارتِ ترقی انسانی وسائل اس اہم ہندوستانی زبان ا...
تہذیب کو استحکام بخشنے میں کلیدی رول ادا کر رہی ہے۔"

قومی اردو کونسل کی ...

متحدہ ترقی پسند محاذ حکومت نے گذشتہ برس اقتدار میں آنے کے بعد اردو داں طبقے کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی ہے۔ متحدہ ترقی پسند محاذ نے اپنے کم از کم مشترکہ پروگرام میں اس بات پر زور دیا ہے کہ "حکومت آئین کی دفعہ 345 اور 347 کے تحت اردو زبان کے نفاذ اور اسے فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔" قومی اردو کونسل حکومتِ ہند کی وزارت ترقی انسانی وسائل کے تحت اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے لیے قومی مقتدرہ کے طور پر کام کر رہی ہے۔ گذشتہ 7 جولائی 2005 کو قومی اردو کونسل کے ایگزیکیٹو بورڈ کی میٹنگ مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل اور کونسل کے چیئرمین جناب ارجن سنگھ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس میں فیصلہ کیا گیا کہ اکیسویں صدی میں فروغ اردو کا لائحہ عمل تیار کرنے اور اس پر عمل آوری کے لیے قومی اردو کونسل کے تنظیمی ڈھانچے میں توسیع کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بنائی جائے، اردو سے وابستہ شخصیات سے صلاح و مشورہ کر کے پالیسیاں وضع کی جائیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے لیے ایک وژن پیپر تیار کیا جائے تاکہ کم از کم مشترکہ پروگرام میں کیے گئے وعدے کو پورا کیا جا سکے۔

مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے ساتھ تفہیم باہمی کے یادداشت نامے پر دستخط : قومی اردو کونسل ابتدا ہی سے کوشاں رہی ہے کہ جو سرکاری یا غیر سرکاری ادارے اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ باہمی تعاون کی راہ ہموار کی جائے۔ اس مقصد کے تحت کونسل نے مولانا آزاد قومی اردو یونیورسٹی کے ساتھ تفہیم باہمی کے یادداشت (Memorandum of understanding) پر دستخط کیے ہیں تاکہ کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے فاصلاتی تعلیمی پروگرام کو مولانا آزاد یونیورسٹی کے فاصلاتی تعلیمی پروگرام سے جوڑا جا سکے۔ اس کی اہم شقیں مندرجہ ذیل ہیں: (الف) کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے اردو ڈپلوما کورس اور مولانا آزاد یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹ کورس کو ملا کر اسکرپٹ رائٹنگ ڈپلوما اور ایڈوانس ڈپلوما کورس کونسل کی طرف سے چلایا جائے اور اس کی سند مولانا آزاد یونیورسٹی کی طرف سے دی جائے۔ (ب) کونسل کی جانب سے چلائے جا رہے کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس کی سند قومی اردو کونسل اور DOEACC چنڈی گڑھ مشترکہ طور پر دیتے ہیں۔ مولانا آزاد یونیورسٹی اس کورس کے الحاق اور ڈپلوما کی سند دینے پر غور کر رہی ہے۔ (ج) مولانا آزاد یونیورسٹی اردو داں طبقے کے لیے تکنیکی تعلیم کے پروگرام کے تحت آئی ٹی آئی کی سطح کے کورس اور پولی ٹکنک کورس منتخب شعبوں میں شروع کر سکتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے آئی ٹی آئی اور پولی ٹکنک کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانے کے لیے ایک وسیع منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں کونسل وزارت محنت کے ماتحت کام کرنے والے خود مختار ادارے نیشنل انسٹرکشنل میڈیا انسٹی ٹیوٹ چنئی اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنیکل ٹریننگ اینڈ ریسرچ، چنڈی گڑھ کی شائع کردہ سول انجینئرنگ، الیکٹریکل انجینئرنگ، میکینکل انجینئرنگ، الیکٹرانک اور کمیونیکیشن انجینئرنگ اور کمپیوٹر انجینئرنگ پر مبنی پولی ٹکنک کورس کی کتابوں کا اردو ترجمہ کرا رہی ہے۔

پیشہ ورانہ کورس کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ: بدلتے ہ... سائنسی اور تکنیکی منظرنامے میں یہ ضروری ہے کہ اردو بھی عہد حاضر کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اردو میں ٹیکنالوجیکل اور پیشہ ورانہ علوم پر مبنی کت... دستیاب ہوں۔ اسی مقصد کے تحت کونسل نے پیشہ ورانہ آئی۔ ٹی۔ آئی اور ڈپلوما انجینئرنگ ... متعلق کتابوں کا ترجمہ کرانے کیلئے پہلا قدم اٹھایا ہے اور پیشہ ورانہ کورسوں کی اٹھارہ کتابو... اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں: الیکٹرانکس ٹیکنالوجی، گھری وائرنگ ... تعارف، گھریلو برقی آلات کی مرمت اور دیکھ بھال، نل سازی کا تعارف، اسکوٹر اور موٹر سا... (مرمت اور دیکھ بھال)، پاور تھریشر کی دیکھ بھال اور مرمت، فوٹو گرافی، پودھ حفاظتی آلا... مرمت اور دیکھ بھال، لکڑی کی دستکاری، باتک، بنیادی کھانا تو بنی، گھریلو اشیا کی دیکھ ریکھ... اور دودھ سے بنی اشیا، دودھ کی پیداوار اور دیکھ بھال، عام باغبانی، بانس دستکاری، ریزم کھلو... شہد کی مکھیاں پالنا۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی : ایک سالہ "ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگ... (ڈی۔ ٹی۔ پی۔)" کورس 1999 سے ملک گیر سطح پر جاری ہے جس کے 183 مراکز ... صوبوں کے 107 ضلعوں میں نئی اردو داں نسل کے تقریباً 13820 طالب علموں (07... لڑکے اور 8123 لڑکیاں) کو سالانہ تربیت فراہم کر رہے ہیں۔ اب تک 22905 طا... علموں (12469 لڑکے اور 10436 لڑکیاں) کو ڈپلوما دیا جا چکا ہے جن میں سے 060... سے زیادہ طلبہ برسرِ روزگار ہیں۔ اس کورس کا مقصد اردو داں طبقے کو نئے ٹیکنالوجیکل منظر نا... حصہ بنانا اور روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن سینٹر: قومی اردو کونسل ملک کے مختلف حص... میں خطاطی اور گرافک ڈیزائن کے دو سالہ کورس کے 23 مراکز چلا رہی ہے۔ ان مراکز کے ق... مقصد اردو طباعت کی صنعتی ضرورتوں کی تکمیل اور اردو کے اس فن کا تحفظ ہے۔

اردو مراسلاتی کورس: قومی اردو کونسل نے اردو رسم خط سکھانے کا شعبہ ... 2001 میں شروع کیا تھا جس میں داخلہ لینے والے ہر عمر اور طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کو ... کو ملک گیر سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ کورس کی مقبولیت کے مدنظر کونسل نے اس کورس کو ... سالہ ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج میں اپ گریڈ کر دیا ہے۔ سال رواں میں کونسل نے اردو ... 190 اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں جن میں کنٹیکٹ کلاس کی سہولت موجود ہے۔ اردو ڈپلوما کورس ... تقریباً 18 ہزار طلبہ نے داخلہ لیا ہے۔

عربی اور فارسی زبانوں کی ترویج و ترقی : عربی اور فارسی وہ اہم زبا... ہیں جنھوں نے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کے فروغ میں تاریخی رول انجام دیا۔ ... ان کے تاریخی رول کو صحیح تناظر میں دیکھتے ہوئے کونسل ان زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیے کو... ہے۔ کونسل مختلف مکاتب و مدارس کو جز وقتی اساتذہ کی تنخواہ اور علمی و ادبی کاموں کے لیے اداکو... روپے کی مالی اعانت فراہم کراتی ہے۔ کونسل کی طرف سے فنکشنل عربی کا دو سالہ ڈپلوما کورس ...

क़ौमी काउन्सिल बरा

جناب محمد علی اشرف فاطمی
وزیر مملکت برائے ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

National Council for P
M/o HRD, Dept. of Secondary & I
West Block-1, Wing No-6, R.K. Puram, New
Fax: 011-26108159 E-mail: urducoun@ndf

یومِ آزادی مبارک

ہم رول ادا کیا ہے۔ یہ زبان امن و آشتی اور ایثار و قربانی کے جذبے کو بڑھاوا دینے میں ہمیشہ آگے رہی ہے۔ اردو کی ان ہی
غ کے لیے پابندِ عہد ہے اور وزارت کے ماتحت قومی اردو کونسل اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ مشترکہ

جناب ارجن سنگھ، مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند

گزاریوں کی ایک جھلک

پریل 2002 میں شروع کیا گیا۔ اس کورس میں 2005 میں تقریباً 13000 طلبہ داخل ہیں۔ اس کورس کے طلبہ کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ کونسل نے طالب علموں کی سہولت کے پیش نظر ملک کے طول و عرض میں 188 عربی اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں۔ ان اسٹڈی سینٹروں میں کنٹیکٹ کلاس کی سہولت موجود ہے۔

شاعتی سرگرمیاں: قومی اردو کونسل حکومتِ ہند کا واحد اشاعتی ادارہ ہے جو صرف اردو کتابیں شائع کرتا ہے۔ کونسل کی اشاعتی سرگرمیوں کے تحت بچوں کے ادب اور اردو ذریعہ تعلیم کی صابی کتابوں پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ اشاعتی منصوبوں میں اردو زبان کے کلاسیکی ادب کی شاعت کے علاوہ لغات، انسائیکلوپیڈیا، حوالہ جاتی کتابیں اور دنیا کی کلاسک اور ٹیکنالوجی اور نسانی علوم کی تمام شاخوں سے متعلق کتابیں منظرِ عام پر لائی جا رہی ہیں۔ کونسل اب تک 91 کتابیں شائع کر چکی ہے۔

کلاسیکی ادب کی اشاعت: قومی اردو کونسل اردو کی ان کلاسیکی کتابوں کی مکرر شاعت پر خصوصی توجہ دے رہی ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب آہستہ آہستہ نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس سلسلے میں کونسل نے 24 جلدوں میں کلیات ہم چند شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کلیات میر (جلد اول)، کلیات آغا حشر کاشمیری (چار جلدیں) کلیات سراج، کلیات قلی قطب شاہ، دیوان فغاں، دیوان درد، دیوان حسرت، کلیات مصحفی، کلیات ذوق، کلیات عیش، کلیات اکبر الہ آبادی، کلیات فانی اور کلیات سردار جعفری (جلد اول) بھی کونسل شائع کر چکی ہے۔ کونسل اتر پردیش اردو اکادمی کی شائع کردہ تمام کتب بھی شائع کر رہی ہے جو اب کمیاب ہیں۔

بچوں کا ادب: مستقبل کے معمار یعنی بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت کے پیش نظر کونسل نے 287 سبق آموز اور معلوماتی کتابیں شائع کی ہیں جن میں چلڈرن بک ٹرسٹ کی تیار کردہ 12 کتابوں کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ کتابیں خوبصورت رنگین تصاویر سے مزین ہیں۔

رسائل و جرائد: قومی اردو کونسل اردو خبروں اور نظریات و خیالات پر مشتمل ماہنامہ "اردو دنیا" اور سہ ماہی علمی مجلہ "فکر و تحقیق" گذشتہ سات سال سے مسلسل شائع کر رہی ہے۔ اردو خبروں، حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں معلومات، تجزیاتی اور معلوماتی مضامین کی وجہ سے "اردو دنیا" کی اردو حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی ہو رہی ہے۔ "فکر و تحقیق" اپنے اعلا تحقیقی مضامین کی بنا پر پسند کیا جاتا ہے۔

کل ہند اردو کتاب میلے اور کتابوں کی فروخت: قومی اردو کونسل نے دہلی میں دو، ممبئی میں دو، سری نگر میں ایک اور حیدرآباد میں ایک کل ہند اردو کتاب میلہ منعقد کر چکی ہے جن میں ہندستان بھر کے اردو ناشرین نے شرکت کی۔ اپنی مطبوعات کو وسیع تر عوامی حلقوں تک پہنچانے کیلئے کونسل ملک کے مختلف حصوں میں منعقد ہونے والے قومی کتاب میلوں میں شرکت کرتی ہے جہاں کونسل کی مطبوعات بڑی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ ان میلوں میں لگ بھگ ایک کروڑ 40 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ رواں سال میں بھوپال اور لکھنؤ میں کتاب میلوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

اسکولی تعلیم، نصاب اور معاون کتب: قومی اردو کونسل کا ایک اہم مقصد اردو ذریعہ تعلیم کو قومی تعلیمی معیار اور مقاصد کے قریب لانا ہے۔ اس مقصد کے تحت کونسل نے NCERT کی تمام کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی ہیں۔ معاون درسی مواد کی فراہمی کے لیے کونسل نے آٹھویں سے دسویں جماعت تک کے لیے 29 کتابیں تیار کرائی ہیں۔ یہ کتابیں علم حیات، علم طبعیات، ریاضی، کامرس اور سماجی علوم کے جدید نصاب پر مشتمل ہیں۔ یہ تمام کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

کتابوں کی خریداری اور اردو کتب خانوں کی مدد: اس اسکیم کے تحت 05-2004 میں 195 اردو مصنفین اور 22 عربی فارسی مصنفین کی 15 لاکھ روپے کی کتابیں خریدی گئیں جو ہندستان کے 690 کتب خانوں میں مفت تقسیم کی گئیں۔

مدرسوں کی تعلیمی معاونت: ایسے مدرسوں کے لیے جو اپنے طلبہ کو جدید علوم سے بھی آشنا کرانا چاہتے ہیں، قومی اردو کونسل نے ماہرین اور مدرسوں کے ارباب اختیار کے تعاون سے سماجی علوم، سائنس اور ریاضی کا نصاب ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ درجات کے لیے تیار کیا ہے۔ اس نصاب کے تحت 26 کتابیں تیار ہو چکی ہیں جن میں سے ابتدائی اور ثانوی درجات کی کتابیں اشاعت کے بعد مختلف مدرسہ بورڈوں کو مدارس میں تقسیم کی غرض سے بھیجی جا چکی ہیں۔

اردو اکادمیوں سے رابطہ: ہندستان میں 15 اردو اکادمیوں کی موجودگی ملک گیر سطح پر اردو کے وجود کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اپنی سرگرمیوں کی شروعات کے ساتھ ہی صوبائی اردو اکادمیوں اور اردو کے دیگر اداروں کے ساتھ باہمی اشتراک و ربط کا سلسلہ شروع کیا تاکہ فروغِ اردو کی پالیسیوں کو زیادہ بامعنی بنایا جا سکے۔ کونسل کے مختلف اغراض و مقاصد میں سے ایک اہم مقصد صوبائی اردو اکادمیوں کے درمیان عملی ربط قائم کرنا اور علمی کاموں کو سمت اور استحکام دینا ہے۔

اردو پریس پروموشن: جدوجہد آزادی، قومی یکجہتی، لسانی و مذہبی اقلیتوں کی ذہنی تربیت اور تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی کے فروغ میں اردو صحافت کے نمایاں رول کے پیش نظر قومی اردو کونسل نے اردو صحافت کے فروغ کیلئے مناسب قدم اٹھائے ہیں۔ کونسل چھوٹے اور درمیانی درجے کے اردو اخبارات کو مالی اعانت فراہم کرتی ہے تاکہ وہ یو۔ این۔ آئی۔ کی اردو سروس سے مستفید ہو سکیں۔ اس اسکیم نے اردو اخبارات کیلئے خبروں اور دیگر مواد کی فراہمی کو آسان کر دیا ہے۔ 47 اردو اخبارات یو۔ این۔ آئی۔ کی اردو سروس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت اب تک 94 لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔

رضاکار تنظیموں کے ساتھ تعاون: اردو زبان کی ترویج و ترقی میں رضاکار تنظیموں کا نمایاں رول رہا ہے۔ تنظیموں کے عوام سے براہ راست رابطے کی وجہ سے اسکیموں کے نفاذ اور ان کے دائرۂ اثر میں وسعت آئی ہے۔ کتابوں کی طباعت نیز اردو کے فروغ کی دیگر سرگرمیوں مثلاً سیمینار، ورک شاپ اور قلیل مدتی پروجکٹ کے لیے بھی کونسل رضاکار تنظیموں کو مالی مدد فراہم کرتی ہے۔

●●●

ڈاکٹر محمد صابر حسین، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

توازن

بادشاہت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ اسلم نے جوہو بیچ (Beach) پر چہل قدمی کرتے ہوئے ایک عربی جوان سے پوچھا۔ ''بادشاہت! بڑی اچھی طرز حکومت ہے۔ جہاں بادشاہت ہے وہاں خوشحالی ہے، امن ہے، عربی جوان نے جواب دیا۔'' ''اور تم اس خوشحالی میں اتنے کھو گئے کہ تمہیں اپنی آزادی خود مختاری بقا اور سلامتی کی کوئی فکر نہیں رہی اور آج دنیا کے نقشے پر تمہاری حیثیت بادشاہ ہو کر بھی بھکاری اور یتیم جیسی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں طاقت بھی کوئی چیز ہے۔ جب تمہارا دل ایمان کی روشنی سے منور تھا تب تم طاقتور تھے اور دنیا میں طاقت کا ایک توازن تھا۔ جب تم عیش و عشرت میں ڈوب گئے تو تمہارا دل ایمان سے خالی ہو گیا اور روشنی کی جگہ تاریکی نے لے لی اور تم بے وقعت ہو کر رہ گئے۔ تم طاقت کی اہمیت کو سمجھو۔'' اسلم نے کہا۔ ''یہ سب بکواس ہے۔ جہاں طاقت ہوتی ہے وہاں جنگ ہوتی ہے اور سب سے بڑی طاقت دولت ہے۔'' عربی جوان نے پُر جوش لہجے میں جواب دیا۔

''ہاں دولت سب سے بڑی قوت ضرور ہے اگر اسکا صحیح استعمال کیا جائے۔ میرا مطلب ہے دولت سے جدید علوم حاصل کرو۔ پھر اس کے ذریعے خود کو طاقتور بنالو ورنہ..........!'' ''ورنہ کیا؟ اُس عربی جوان نے فکر مندی کا اظہار کیا۔'' ''ورنہ ایک دن تمہاری رہی سہی دولت ختم ہو جائے گی اور تمہارا وجود بھی۔'' ''تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل؟ اُس عربی جوان نے دوبارہ سوال کیا۔

ہاں ہے تم ذرا غور سے سنو۔ ''جنگل کے دو بڑے شیر بادشاہت کے دعوے دار تھے۔ اس کے لئے دونوں ایک دوسرے کو آنکھیں دکھاتے۔ دونوں ایک دوسرے پر غراتے اور گرجتے لیکن برستے نہیں تھے۔ اس لئے کہ دونوں کو اپنی زندگی پیاری تھی۔ دونوں کے دانت ایٹمی میزائل کی طرح نوکیلے اور خطرناک تھے۔ جب تک دونوں میں سرد جنگ تھی تب تک جنگل کے دوسرے چھوٹے بڑے جانور بڑی عافیت اور سکون سے تھے لیکن وقت کی ستم ظریفی سے ایک شیر دوسرے شیر کی سیاست کا شکار ہو کر اپاہج ہو گیا۔ اب کیا تھا دوسرا شیر جنگل کا شہنشاہ بن بیٹھا۔ اب تو وہ جس علاقے میں چاہتا منھ مارتا۔ اُسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اپاہج شیر کبھی کبھی اُس کی زیادتیوں کی مخالفت کرتا تو توانا شیر کی گرج سے خوف زدہ ہو کر اپاہج شیر فوراً نظریں جھکا لیتا۔ اس لئے جنگل ہو یا انسانی سماج دنیا میں انصاف امن اور ہر مخلوق کی بقا کیلئے طاقت کا توازن ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں؟ اسلم نے زور دے کر کہا۔

''اُس عربی جوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے اسلم کو غور سے دیکھا۔ مسکرایا۔ پھر اپنی یورپین گرل فرینڈ کی باہوں میں باہیں ڈال کر سمندر میں اُٹھتی ہوئی لہروں کی طرف چل پڑا۔

محمد رفیع الدین مجاہد، مظفر نگر، اکولہ (مہاراشٹر)

سر پھرا

زلزلہ اتنی شدت کا تھا کہ ریکٹر پیمانہ پر بھی گویا تھرتھراہٹ اور کپکپاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ پورا شہر، شہرِ خموشاں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہزاروں کے مارے جانے اور سیکڑوں کے مجروح ہونے کا خدشہ تھا۔ بے شمار گھر ریت کے گھروندوں کی مانند چند لمحوں میں مسمار ہو چکے تھے۔ گھروں کی چھتیں زمین کی سطح سے مل چکی تھیں اور بڑی بڑی عالیشان و فلک بوس عمارتیں زمین پر اوندھے منھ پڑی تھیں۔ یہ اب تک کا سب سے زیادہ تباہ کن زلزلہ شمار کیا جا رہا تھا۔

زلزلہ یوں اچانک سوئے ہوئے لوگوں پر آفت بن کر ٹوٹا تھا کہ سنبھلنے تک کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ موسمیات کا محکمہ قبل از وقت آگاہ کرنے میں ناکام ثابت ہوا تھا۔ ہر سمت کہرام مچا ہوا تھا اور لوگ ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ رہے تھے۔ پورے ملک میں جیسے ہنگامی حالات پیدا ہو چکے تھے اور انتظامیہ اپنے کام میں جٹی ہوئی تھی۔ ملبے سے دبی ہوئی لاشیں، لہو رنگ لاشیں اور سسکتے ہوئے زخمیوں کو نکالا جا رہا تھا۔

ایک آدمی ادھر سے اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے وہ بے چارہ اپنے کسی عزیز کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اس کی بے قراری اور بے تابی اس کے مسکین سے چہرے سے صاف جھلک رہی تھی اور اس کا کسی کو ڈھونڈنے کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بچہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر...... پھر سے ڈھونڈنے میں لگ گئی ہو۔ کسی نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

''تم کسے ڈھونڈ رہے ہو؟'' مگر وہ کچھ بھی نہیں بولا۔

''تم اس قدر ہراساں اور پریشاں کیوں ہو رہے ہو بھائی؟'' وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا۔

''کہیں تم بہرے یا گونگے تو نہیں ہوا'' کسی نے اسے پکڑ کر زبردستی کہلوانا چاہا۔

''ن...... ن نہیں تو......'' وہ بڑی مشکل سے بولا۔

''پھر بولو نا! کسے ڈھونڈ رہے ہو؟ خدا تمہاری مدد کرے'' ایک مولانا نے تسلی دے کر پوچھا۔

''آ...... ا...... اصل میں...... مُ...... مجھے حضرت عمرؓ کی تلاش ہے'' وہ بس اتنا بول پایا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اقبال انصاری، نئی دہلی

بھاری بھرکم

اُس بھاری بھرکم آدمی کی بڑی بڑی سیاہ مونچھیں ہی گھنی نہیں تھیں، وہ خود بھی بے حد گھنا لگ رہا تھا۔ اٹیچی اُس نے فرش پر رکھ دی، پھر خود بھی آلتی پالتی مار کے فرش پر بیٹھ گیا اور اٹیچی کھولی۔ اُس کے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو ایک نظر میں ہی اندازہ بھی ہو گیا اور یقین بھی کہ اٹیچی میں نظر آنے والی سو سو کے نوٹوں کی گڈیوں کے نیچے بھی سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں ہی ہیں۔

سادگی لیکن نفاست سے سجے ہوئے اس ڈرائنگ روم میں اُن دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''ہجور'' گھنی مونچھوں والے بھاری بھرکم نے بیٹھے ہی بیٹھے سر اُٹھا کر اپنے سامنے کھڑے شخص کے حیرت زدہ چہرے پر نگاہیں ڈالیں اور ہاتھ جوڑ کر بولا ''اس اٹیچی میں کیول ایک ہجار گڈی ہی سمائے سکیں...... مطلب ایک کروڑ...... یدی یہ کم لگیں تو ایسی ہی ایک کروڑی اٹیچی ہم اور لائے دیں گے...... کوئی سمسیا نہیں...... ویسے...... ایک کروڑ بھی کم ناہیں ہوتے...... وہ جو ہے نا...... آپ جانو...... ارے وہ چھوٹا کپتان...... وہ کہہ رہا تھا ایک کروڑ مجھے دئے دیو...... اتنے میں تو میں دس کتل کر دوں گا...... یہ چھوٹا کپتان بڑا بدماس ہے...... ہم نے کہا چل بے...... یہ ایک کروڑ ہم ہجور کو دینے جائے رہے ہیں...... ہاں، یدی ہجور نے نا لیے تو ہم بے سک تجھے دئے دیں گے، پھر جو مرجی آئے، کرنا۔ بڑا بدماس ہے...... آپ نے تو سنے ہوئیں گے اُس کے کارنامے...... تو مطلب یہ کہ ہجور یہ اٹیچی سویکار کر لیں۔ آپ کا بیٹا مسوری پبلک میں بارہویں کچھا میں پڑھتا ہے۔ بڑا پیارا لڑکا ہے۔ اسے کامٹی پھال پے نہاتے دیکھا تھا...... ارے اپنا وہ کامٹی پھال، مسوری سے پندرہ کلومیٹر دور ٹہری گڑھوال میں جو ہے نا، وہیں دیکھا تھا...... بہت سُندر ہے آپ کا بیٹا...... اکلوتا بیٹا ویسے بھی بہت سُندر ہووے ہے۔ آپ یہ اٹیچی لئے لیویں گے تو بھگوان اُسے اچھا رکھے گا...... بھگوان بھی اور چھوٹا کپتان بھی...... آپ تو ہجور سمجھدار آدمی ہیں...... ایک وہ تھے...... سری گردھر گوپال...... بے کوف! ہم ہی ان کے پاس اٹیچی لے کر گئے تھے...... نہیں مانے...... دھکے دے کر ہمیں بھگائے دیا۔ ہم چلے آئے۔ راستے میں چھوٹا کپتان کا ڈیرا پڑتا تھا...... ہم وہ اٹیچی چھوٹا کپتان کو دے دئے...... کیا کرتے۔ ایک کروڑی بوجھ کہاں تک اٹھاتے...... آپ نے تو سُنی ہوئے گی اُس کی وہ بدماسی...... چھوٹا کپتان کی!''

''کیا چاہتے ہو؟''

''جگدمبا پرساد کی جندگی'' بھاری بھرکم کی چوڑی مسکراہٹ بڑی سنجیدہ تھی۔

''خلاصہ کرو!''

بھاری بھرکم نے خلاصہ کر دیا۔

''آدھے منٹ میں تم اگر یہ اٹیچی لے کر یہاں سے چلے نہیں گئے تو میں پولس کو بلا کر تمہیں سلاخوں کے پیچھے بھجوادوں گا...... گٹ آؤٹ!''

بھاری بھرکم کی چوڑی مسکراہٹ سکڑتی چلی گئی...... پھر وہ بھی چلا گیا...... اٹیچی لے کر۔

❀ ❀ ❀

جسٹس تلک راج سنہا کی کورٹ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ جگدمبا پرساد کی اپیل پر آج فیصلہ سنایا جانا تھا۔

جگدمبا پرساد پر ایک جرمن سوشل ورکر اور اس کے دو بیٹوں کے قتل کا جرم زیریں عدالت میں ثابت ہو چکا تھا اور زیریں عدالت کے جج جسٹس گردھر گوپال جگدمبا پرساد کو سزائے موت کا حکم سنا چکے تھے۔ جگدمبا پرساد کے دفاع میں مزید افراد اور مزید تنظیمیں عمل پیرا ہو گئیں۔ جسٹس گردھر گوپال کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر دی گئی...... اور اُسی رات جسٹس گردھر گوپال، ان کی پتنی اور ان کی دونوں بیٹیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

ہائی کورٹ میں جگدمبا پرساد کی اپیل پر سماعت ہوئی، پھر مزید سماعتیں ہوئیں۔ اور آج کورٹ کا فیصلہ آنا تھا۔ ٹھیک دس بجے جسٹس تلک سنہا اپنی کورٹ میں آگئے۔

سب کو تو نہیں، البتہ بہت سے لوگوں کو یقین تھا کہ ہائی کورٹ جگدمبا پرساد کی سزائے موت کے لوئر کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھے گا۔

جسٹس تلک راج سنہا نے جگدمبا پرساد کی موت کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا...... اور اگلے دن ملازمت سے Voluntary Retirement کے لئے درخواست دے دی۔

فاروق راہب، موتیہاری (مشرقی چمپارن)

کرفیو

سب سے زیادہ فکر مند تو سکینہ تھی۔

یہ کیوں اور کیسے ہو گیا؟

ایسا خوف ناک اندھیرا تو کبھی نہیں پھیلا تھا۔

لیکن اسے تو گھپ اندھیرے کے خطرناک گڈھوں کو پار کرنا تھا۔ مگر کیسے؟

''ابو! یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''چپ! آواز اونچی نہ کر اور دیکھ، بستر سے ہلنا نہیں، دم سادھے پڑی رہ۔''

''لیکن، دینو کاکا''

''خاموش، دینو کاکا کی بچی! امی بھی آنکھیں نکالتی ہوئی پھنکاریں...... باہر موت کے ہرکارے گھوم رہے ہیں۔''

امی اور ابو کے تیور نے اسے اور سہما دیا۔

اس شہر کو ہو کیا گیا ہے؟

ننھا دماغ حیران تھا۔

''اس سے پہلے تو ایسا نہیں تھا''

آنکھوں کو چکا چوندھ کر دینے والا عالیشان پنڈال اپنے شائقین کو قریب آنے کی، دور ہی سے دعوت دے رہا تھا اور زائرین کسی مقناطیسی کشش کے زیر اثر اس کی جانب کھنچے چلے آ رہے تھے۔ اس میں ایستادہ مورتی کے رعب جمال سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ کلاکار کی درازئے عمر کی دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ لیکن دیوی کے شیر کے پنجے کے نیچے دبے ڈراونے راکشش کے بھیانک کھلے منہ کو جب دیکھتے تو ان کی آنکھیں وحشت سے بند ہو جاتیں اور دونوں ہاتھ جڑ کر پیشانی تک اٹھ جاتے اور ہونٹ جے امبے، جگد مبے کا ورد کرنے لگتے۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔

لوگ دیوی درشن اور پوجا ارچنا میں لگے تھے۔ دھوپ اور لوبان کی خوشبوؤں سے فضا پر عجیب سی پر کیف غنودگی طاری تھی اور جے ماتا، جے درگے کی دھیمی مترنم آوازیں ماحول کو پاکیزہ و اساطیری داستانوں کے جہاں کی سیر کرا رہی تھیں۔ دفعتۃً کوئی دیوانہ سازشی چلا پڑا۔ ''راکشش کے منہ میں بم ہے۔''

وحشی رقص کے لئے اتنا کافی تھا۔ ایسا لگا کہ مجمع میں چہار سمت سے سانپ گھس آئے ہوں۔ سب ایک دوسرے کو روندتے گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص بدحواس سا کسی طرح وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا تھا۔ دل فریب و مقدس نظارے اور مسرتوں سے بھرا پنڈال پلک جھپکتے، چیخ و پکار، آہ و بکا میں تبدیل ہو گئے۔ پنڈال میں آگ بھی لگ گئی۔ پنڈال دھڑا دھڑ جل رہا تھا اور شعلوں کی لپیٹ میں آنے والے اس کی نذر ہوتے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ فساد بھی بھڑک اٹھے۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا؟ یہ شہر تو شانتی کا پجاری تھا۔ سب بھائی کی طرح رہتے تھے۔ دھرم کی دیوار کبھی حائل نہیں ہوئی۔ پھر یہ کیوں اور کیسے؟

تمام لوگ حیرت زدہ تھے۔ لیکن ہجوم میں چھپے لٹیروں کی پہچان تو ناممکن ہے!

شہر کے حکام کا خیال تھا کہ مجرمانہ ذہنوں نے چنگاری بھڑکائی ہے۔ چوبیس گھنٹوں کی انتھک کوششوں کے باوجود مقامی پولس فساد کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی تو فوجی اور نیم فوجی دستوں کی مدد طلب کی گئی اور سخت ہدایات کے ساتھ بہتر گھنٹے کے کرفیو کا اعلان کیا گیا۔ جس میں دیکھتے ہی گولی مارنے کا حکم بھی شامل تھا۔ مکانوں کی تمام کھڑکیاں، دروازے اور روزن بند رکھنے تھے اور تیز روشنی بھی نہیں جلانی تھی۔ رات کے دبیز سیاہ آنچل کے زیر سایہ گھبراسنا ٹا سانسیں لے رہا تھا۔ پورے شہر پر قبرستان کی سی خاموشی چھائی تھی۔ سبھی اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے ہوئے تھے۔ کہیں سے کوئی صدا نہ آہٹ۔ بس کبھی کبھار کوئی کتا بھونک کر سناٹے کو چیرتا یا پٹرولنگ گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ ویرانے کو لرزاتیں اور اس کے بعد پھر وہی دہشت ناک تاریکی! المناک حادثے کے سوگ میں آسمان بھی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور سنسناتی چپی میں دردناک سسکیاں ڈول رہی تھیں۔

فوجی دستوں کے آنے سے شہر نے تھوڑی راحت محسوس کی اور بے اطمینانی کی طوفانی لہروں کا حملہ بھی ذرا کم ہوا، لیکن سکینہ کی پریشانیاں اپنی ہٹ پر قائم تھیں۔ دینو کاکا کی فکر اسے کھائے جا رہی تھی۔

دونوں گھرانوں کے تعلقات کافی پرانے اور مضبوط تھے۔ مکانوں کے بیچ صرف کولتار کی سڑک حائل تھی۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری لکیر ان کے درمیان نہیں تھی۔ ان کی دوستی مثالی بن گئی تھی۔ سکینہ دینو کاکا کے لئے روز صبح سویرے پوجا کے پھول لے جاتی اس سے رفاقت پر جذباتی رنگ بھی چڑھ گیا تھا۔ بیماری کی حالت میں بھی وہ امی یا ابو کی گود میں سوار ہو، دینو کاکا کو پھول دے آتی اور دینو کاکا کو بھی اس کے معصوم پیار بھرے پھول کا انتظار رہتا۔ مگر آج!

ایک ہی کمرہ میں تین پلنگ لگے تھے۔ اس نے گردن اٹھائی۔ امی اور ابو کے بستر خالی تھے۔ اس نے دیوار گھڑی پر نظر ڈالی۔ صبح کا چار بجنے والا تھا۔ اس نے سوچا اسی وقت پھول دے آنا ٹھیک رہے گا۔ یہ اچھا موقع ہے، یہی سوچ کر وہ دھیرے سے اپنے بستر سے اتری۔ دوسرے کمرہ میں جھانکا، دونوں تلاوت کلام پاک میں منہمک تھے۔ وہ دبے پاؤں آنگن میں آئی۔ تھوڑے پھول دامن میں سمیٹے اور ہوشیاری سے قدم رکھتی بیرونی دروازہ تک پہنچی اور آہستہ سے کنڈی کھسکا کر باہر آگئی اس نے ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا، کہیں کچھ نہیں تھا۔ کاکا کے گھر کی طرف وہ تیزی سے دوڑی، لیکن اسی وقت پولس کی ایک گشتی گاڑی کہیں سے آدھمکی۔ گولی چلی اور ایک دہلا دینے والی کربناک چیخ فضا پر حاوی جمود کو چھیدتی دور تک پھیل گئی۔ دینو کاکا!!''

دینو کاکا اپنے آنگن میں نہانے کی تیاری کر رہے تھے۔ گولی کی آواز اور چیخ سن کر ان کے ہاتھ سے لوٹا چھوٹ گیا۔ وہ بڑی سرعت سے باہر کی اور لپکے۔ اردگرد کے مکانات سے بھی کچھ لوگ نکل آئے۔ امی اور ابو بھی اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔ امی تو اسے خون میں لت پت دیکھتے ہی غش کھا کر گر پڑیں۔ ابو اسے سینے سے چمٹائے ہچکیاں لے رہے تھے۔ فوجی جوانوں نے اپنی ٹوپیاں اتار لی تھیں۔ دینو کاکا بھیڑ کو چیرتے ہوئے آئے تو دہلا دینے والے خونی منظر کو دیکھ کر انہیں چکر سا آیا، پھر بھی انہوں نے خود کو سنبھالا اور اسے ابو کی گود سے اپنی گود میں جیسے ہی لیا۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور ڈوبتے لہجے میں پکارا۔ کاکا!'' اور اپنا دامن جسے وہ اب تک اپنی مٹھی میں سمیٹے ہوئی تھی، مٹھی کھلی تو پھول زمین پر بکھر گئے اور اس دل خراش منظر پر کتنوں کی چیخیں نکل گئیں۔

''ارے پگلی! آج میں بغیر پھول کے ہی پوجا کر لیتا۔'' اس کی پیشانی اور گالوں کو بے تحاشا چومتے ہوئے دینو کاکا کپکپاتی آواز میں بولے، لیکن سکینہ تو بے آواز اور بے حرکت ہو چکی تھی۔

سیّد مظفر شعیب ہاشمی، آئی جی پولس (ویجیلینس)، پٹنہ

ہائی جیکرز

سول لائن تھانہ میں انسپکٹر کم آفیسر انچارج کی حیثیت سے جوائن کرنے کے بعد سب سے پہلے جس شخصیت سے میری ملاقات ہوئی، وہ سب انسپکٹر، مرزا ابشارت علی بیگ کی تھی۔ لانبا قد، گورا چٹا رنگ، آنکھوں پر چشمہ۔ عمر تقریباً پچاس پچپن سال کی رہی ہوگی۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ کلّے میں ہر وقت پان اور ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ڈنڈا، اُن کی شخصیت کی علامت تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کا ڈنڈا سارے شہر میں مشہور ہے۔ ہر وقت بغل میں دبائے رکھتے تھے۔ شہر کے سارے بدمعاش انہیں دیکھتے ہی دور سے کھسک لیتے۔ موٹر سائیکل میں اُسے کھونسنے کے لئے الگ سے ایک رنگ جیسا بنوا رکھا تھا۔ ان کی شخصیت نہ صرف شہر میں مشہور تھی بلکہ یہ ہر دل عزیز بھی تھے۔ شہر کے بچے انہیں 'چچا' کہتے تھے اور انہیں دیکھتے ہی گھیر لیتے اور طرح طرح کی فرمائش کرتے اور یہ بھی بچوں کے لئے ہر وقت اپنے پاکٹ یا موٹر سائیکل کی ڈگی میں ٹافیاں رکھتے۔ ان کا تبادلہ شہر کے ایک تھانے سے دوسرے تھانوں میں ہوتے رہنے سے پورا شہر ان سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا اور بچوں کے چچا شہر کے ہر خاص و عام کے چچا بن گئے تھے۔ میں ان کو بہت پہلے سے جانتا تھا مگر یہ پہلی بار میری ماتحتی میں آئے تھے۔ ان کا آبائی مسکن علی نگر، دربھنگہ تھا مگر بچوں کو لکھانے پڑھانے کے لئے پٹنہ کو ایسا پکڑا کہ پھر وہیں کے ہو رہے، مگر علی نگر ان کے دل و دماغ سے کبھی نہیں گیا۔ دورانِ گفتگو وہ علی نگر کے تذکرے کے لئے موقع نکال ہی لیتے تھے۔ محکمے میں ان کے دوست انہیں، بیگ صاحب ڈنڈا والے، یا بیگ صاحب علی نگر والے کہتے۔ کچھ مذاق بھی اُڑاتے مگر ان کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ تھانہ کے سرشتہ میں داخل ہوتے ہی سلام علیکم کا نعرہ لگاتے ہوئے سلیوٹ کیا۔ ڈنڈے کو تھامتے ہوئے کرسی پر بیٹھے اور مسکراتے ہوئے بولے:

''نئی پوسٹنگ مبارک ہو'' ''شکریہ'' میں نے کہا۔ ''آپ کا پچھلا تھانہ تو بڑا گڑبڑ تھا۔ ہر طرف علاقے میں کرمنل بھرے تھے مگر آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے تین سال اسے چلایا'' میں کچھ نہیں بولا۔ سپاہی کو اشارے سے چائے لانے کے لئے کہا۔ وہ چلا گیا۔ ''مگر یہ علاقہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے یہاں لے دے کے بس کبھی کبھار Robbery ہو جاتی ہے''

مرزا صاحب بغیر رکے بولتے رہے۔ اگر چائے نہ آجاتی تو یہ سلسلہ جاری ہی رہتا میں نے چائے کی پیالی ان کی طرف سرکائی۔ اسی دوران فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فون پر دوسری طرف میرے ایک پرانے ملاقاتی تھے۔ میں ان سے باتیں کرتا رہا۔ اور درمیان میں چائے کی سپ لیتا رہا فون رکھتے ہی چائے بھی ختم ہو چکی تھی۔ ''سر!'' بیگ صاحب نے مجھے پھر مخاطب کیا''

''تھانہ سے اُتر کچھ دور پر مسجد ہے اور وہاں ایک مسلم ہوٹل بھی ہے۔ وہاں ہر چیز ملتی ہے'' وہ مسکراتے

ہوئے بولے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گیا مگر بات کو اُڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''تھانہ کتنے سیکٹر میں بنتا ہے؟'' ''تین سیکٹر میں۔ ایک کا انچارج میں ہوں۔ دوسرے کا سیارام سنگھ ہیں۔ اور تیسرا رام دیو بابو کا ہے'' وہ بولے۔ ''اچھا! آپ کے زون کی کیا خاصیت ہے'' میں نے پھر پوچھا۔ ''یونیورسیٹی، مڈیکل کالج اور تین سینما گھر'' وہ دھیرے سے بولے پھر ایک دم چہک کر بولے۔

''اُردو کتابوں کی تین چار اچھی اچھی دکانیں بھی ہیں'' ''آپ کو اُردو ادب سے دلچسپی ہے؟''

اب کی باری میری ایل۔ بی۔ ڈبلو (L.B.W.) ہونے کی تھی۔ میری تعلیم انگلش میڈیم سے ہوئی تھی۔ اردو ادب سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مرزا صاحب کے ذریعہ مجھے اس طرح کے نامانوس پچ پر کھینچ لئے جانے سے میں گھبرا گیا۔ مگر اس کا اظہار چہرے سے نہیں ہونے دیا۔ فوراً بولا

''اردو ہماری مادری زبان ہے۔ گھر کا ماحول ادبی تھا اس لئے کچھ نہ کچھ لگاؤ تو ہے ہی'' کہنے کو تو میں نے کہہ دیا مگر گھر پر جب نظر ڈالی تو سارے بچے انگلش میڈیم سے پڑھتے دکھائی دیے جنہیں اردو تو اردو، گنتی بھی ٹھیک سے اردو میں نہیں آتی تھی۔ اگر بات چیت کے درمیان چونتیس (۳۴) یا سینتالیس (۴۷) جیسا لفظ منہ سے نکل گیا تو بچے سوال کرنے لگتے کہ اِسے انگریزی میں کیا کہتے ہیں اور جب انہیں بتاتا کہ Thirty-four یا Forty-seven کہتے ہیں، تب بات ان کی سمجھ میں آتی۔ تو یہ حال تھا گھر میں اردو کا۔ بس ایک بیگم ہی ہیں جن کے دم سے اردو کی محفل گھر میں آباد ہے۔ میں سوچتا رہا۔ اسی درمیان مرزا صاحب نے لفظ، گھر، کو پکڑ لیا بولے'' اجی سر! گھر کی کیا بات ہے۔ ہمارے گھرانے نے اردو ادب کی بہت خدمت کی ہے'' وہ رُک کے پان کی ایک گلوری منہ میں دبائی۔ ایک میری طرف بڑھائی۔ میں پان نہیں کھاتا ہوں۔ مگر ان کا دل رکھنے کے خیال سے ایک گلوری ان کی پن بٹی سے نکال لیا۔ ''ہمارے علی نگر میں تو اردو کی کھیتی تھی'' وہ زردہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولے۔ ''ایسے ایسے باکمال شاعر اور ادیب اس کی مٹی نے پیدا کئے ہیں جن کی نظیر جلد نہیں ملتی'' انہوں نے جملہ مکمل کیا'' ہاں میں نے سنا ہے'' میں نے دھیرے سے کہا۔ ''مگر اب علی نگر وہ علی نگر نہیں رہا'' وہ پھر شروع ہوئے'' تقسیم ہند کے بعد علم وفن کے قدرداں پاکستان ہجرت کر گئے اور یہاں کی محفلیں اُجڑ گئیں۔''

''پاکستان بننے سے ایک علی نگر نہیں، ملک کے سینکڑوں علی نگر برباد ہو گئے۔''

میں نے دھیرے سے کہا اور پھر چونک کر بولا۔ ''آپ کی گشتی کس وقت سے ہے؟''

''ارے جناب! باتوں کے درمیان یاد ہی نہیں رہا۔ بس ابھی ابھی نکلتا ہوں'' اور وہ آفس نکل گئے۔ اسی وقت میرے بچپن کے دوست، رضی الدین ملک تشریف لے آئے۔ آتے ہی پہلے تو مبارک باد دی اور پھر چونک کر بولے۔ ''یہ تم نے پان کھانا کب سے شروع کر دیا ہے؟''

''مرزا بشارت بیگ نے اپنی پن بٹی میری طرف بڑھائی تو ان کا دل رکھنے کے لئے منہ میں ڈال لیا۔'' میں نے کہا۔ ''بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اردو فارسی دونوں میں ایم۔ اے ہے اور اردو ادب کا تو شیدائی ہے'' رضی بولا۔ ''اچھا'' میں نے پھر دھیرے سے کہا۔ ''ہاں بھئی! میری تو ان سے گہری واقفیت ہے۔ وہ خود بھی ایک

اچھے شاعر ہیں۔ میر، غالب، مومن سے لے کر فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی کے بیشتر کلام انہیں زبانی یاد ہیں'' رضی جیب سے سگرٹ کا پیکٹ نکالتے ہوئے بولا ''اردو شاعری ہی نہیں، اردو ادب پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ قرۃ العین حیدر کے تو مداح ہیں۔ ان کی ساری کتابیں ان کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ مگر وہ آج کل کے کچھ نئے لکھنے والوں سے بہت ناراض بھی ہیں'' رضی بولا۔ ''چھوڑ و یار! کچھ دوسری باتیں کرو'' میں نے رضی کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔ ''تمہارا پریس کیسا چل رہا ہے؟'' اس نے ایک پریس کھول رکھا تھا۔ اور ان دنوں اس کا گولڈی پریس، سونے کے انڈے دے رہا تھا۔ '' کیا پریس چلے گا؟'' ان دنوں بیگم کی علالت کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' وہ سگرٹ سلگاتا ہوا بولا۔ اسی وقت تھانے کا منشی دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔

''سر! اورینٹل اسپتال میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ بلوہ ہونے کا اندیشہ ہے''

''کن لوگوں کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے؟'' میں کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ '' یہ تو پتہ نہیں ہے۔ ارون مڈیکل اسٹورس سے فون آیا ہے جو اسپتال کے سامنے سڑک سے دکھن ہے'' وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے! میں دیکھتا ہوں'' کہتے ہوئے میں آفس سے باہر نکل آیا۔ رضی سے ہاتھ ملانے کے بعد جیپ پر بیٹھا اور فورس کے ساتھ سڑک پر نکل آیا۔ وائرلیس پر مرزا کو کال کرتے ہوئے اسپتال پہنچنے کے لئے کہا۔ ہم دونوں تقریباً ایک ہی وقت اسپتال پہنچے۔ اسپتال کے گیٹ پر زبردست بھیڑ تھی۔ مجمع طرح طرح کے نعرے لگا رہا تھا۔ پولس دیکھتے ہی وہاں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے ہٹ کر ہمیں راستہ دے دیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے لوگوں سے پوچھا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں آگے بڑھتے ہوئے اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ مرزا فورس کے ساتھ میرے پیچھے تھے۔ راہداری میں بہت سارے لوگ سوٹ میں نظر آئے جنہوں نے راستہ مسدود کر رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لوگ بھی ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اور میں آگے بڑھتا گیا۔ یہ راستہ ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر ختم ہو گیا۔ چند لمحے رُکنے کے بعد میں نے آپریشن تھیٹر کے دروازے کو پش کیا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں چار پانچ ڈاکٹر تھے۔ دو کے ہاتھوں میں عجیب و غریب قسم کے سرنج اور دو کے ہاتھوں میں الگ طرح کے نشتر تھے اور وہ سبھی ایک ٹیبل پر لیٹی ہوئی ایک لڑکی کی طرف متوجہ تھے میں نے غور سے دیکھا۔ اتنی خوبصورت اور پیاری سی لڑکی میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سیندوری مائل سرخ و سفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں جن پر گہری سیاہ پلکیں۔ سیاہ، گھنیرے لمبے بال، سرخ پیارے سے ہونٹ، سرو قد متناسب اعضا غرض وہ ایک شاہکار تھی۔ میرے ذہن میں یونان کی زہرا کی مورتی کوند گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے دماغ نے بتایا کہ زہرا بھی اتنی پیاری اور حسین نہیں تھی۔ لڑکی کی آنکھیں بند تھیں مگر آنسوؤں کے قطرے اس کے گالوں پر دور سے ہی دکھائی دے رہے تھے۔ سبھی ڈاکٹر لڑکی کے علاج میں مشغول تھے۔ لڑکی کے چہرے پر گہری نقاہت طاری تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت بے چین ہے مگر زبان سے اظہار کرنے میں قاصر سی ہے۔ ڈاکٹروں کو دیکھتے ہی مرزا کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ''ٹھہرو'' وہ دہاڑتے ہوئے ڈاکٹروں کی طرف بڑھے۔ ہاتھ میں ان کا ڈنڈا بھی لہرایا تھا۔ سارے ڈاکٹر گھبرا گئے اور لڑکی کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ '' مرزا صاحب! آپ یہ کیا کر رہے

ہیں۔ ڈاکٹروں کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ صحیح نہیں ہے۔ آخر وہ مریض کا علاج ہی تو کر رہے ہیں'' میں نے کہا۔
''علاج؟ یہ اسپتال نہیں ہے۔ بوچڑ خانہ ہے اور یہ سب ڈاکٹر نہیں ہیں'' مرزا گرجے۔

''کیا مطلب؟'' میں نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔

''یہ لڑکی جو مریضہ ہے، دوشیزۂ اردو ہے اور ان لوگوں نے اسے اغوا کر لیا ہے

یہ اس کے جسم کو دوا کے نام پر زہر آلود کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جدیدیت کے ماہر ہیں اور وہ مابعد کے مبلغ ہیں'' انہوں نے دو ڈاکٹروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا'' ڈاکٹروں کی یہ جماعت دوشیزۂ اردو کے خود غرض، شہرت پسند اور اندھے عاشقوں کی ہے، یہ اس سے اظہار عشق اپنی شہرت اور اپنی قدآوری ثابت کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ اس کے فطری اور جادوئی حسن پر شب خونی کرتے ہوئے اپنے ابہام زدہ لیباریٹری میں لے آئے ہیں۔ یہ اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق اس کے معنوی وتخلیقی، حسن وجمال میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ کوئی اس کے جسم نازک سے صبح بنارس اور شام اودھ کا حسن ختم کر دینا چاہتا ہے تو کوئی اس کی زلف بنگال کا دشمن ہے۔ کوئی ذات کے کرب کا ترجمان اس کو بنانا چاہتا ہے تو کوئی اس کے منھ سے روٹی، کپڑہ اور مکان کے نغمے سننا چاہتا ہے۔ ان لوگوں نے اردو کا برا حال بنا رکھا ہے۔ ان پر دفعہ ۳۶۶/ ۳۰۷ تعزیرات ہند کا معاملہ بنتا ہے کہ اپنی غلط مطلب برآری کے لئے کسی کو زخمی کر رہے ہیں۔'' وہ دہاڑے اور ڈاکٹروں سے مخاطب ہوئے۔

دوشیزۂ اردو کو آپ لوگ اس کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ اس کی صحت خود بخود بحال ہو جائے گی کہ یہ بے حال تھی ہی کب؟'' مرزا اپنا ڈنڈا لہراتے ہوئے بولے۔ وہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹروں کی حالت غیر تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مرزا کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ادب کے ان ڈاکٹروں کے خلاف کارروائی کے حق میں ہیں اور میں سوچ رہا تھا کہ پولس کی مداخلت کا کوئی جواز مجھے دکھائی نہیں دیتا۔

اس شمارہ کے مخصوص شاعر: شاہد جمیل

شاہد جمیل ۵ار جنوری ۱۹۵۶ء کو ڈہری اون سون میں پیدا ہوئے۔ ان کا شعری مجموعہ ''خوابوں کے ہمسائے'' (۹۲ء)، سوہائیے (۰۲ء) کہہ مکرنیوں کا مجموعہ عکس اندر (۰۳ء)، ڈاکٹر ہرگانوی کے اشتراک سے دوہا رنگ (۰۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ شاہد جمیل شخص اور شاعر مرتب مناظر عاشق ہرگانوی ۰۵ء میں منظر عام پر آئی ہے۔ عبدالمنان طرزی کی منظوم کتاب زیر اشاعت ہے۔ ماہنامہ سہیل گیا نے شاہد جمیل نمبر ۹۸ء میں شائع کیا۔ ۷۷ء تا ۸۸ء کے بہار ٹکسٹ بک کے نصابی کتاب میں ان کی نظم درجہ نہم میں شامل رہی۔ ان کی ادارت میں سہسرام سے جدید اسلوب (۹۶ء) کے ۵ شمارے شائع ہوئے۔ موصوف ان دنوں مونگیر میں ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار ہیں۔ شاہد جمیل جس عہد کے شاعر ہیں اُس میں فنی خوبیاں موجود ہیں اور اُس سے وہ کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے حالاں کہ لفظوں کے انتخاب میں انہوں نے ہر جگہ Compromise کیا ہے۔ یہ بات اس لئے کہی جا رہی ہے کہ ہر عہد میں کچھ مخصوص الفاظ مخصوص معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں بھی اپنے عہد کے مخصوص الفاظ موجود ہیں جیسے زرد پتوں، سبز پڑی، قرب کی دھوپ، سائباں، آئینہ، دستکیں، دروازہ، آسیب، پتھر، کھنڈر، سراب، اپنی ذات، کاغذ کی کشتیوں، اجنبی، رہنمائی وغیرہ لیکن سلیقۂ اظہار میں نیا پن ہے۔ اظہار کا ابہامی انداز ان کا مخصوص شعری رویہ ہے۔ ان کی شاعری میں لفظوں کے ساتھ جڑے ہوئے لفظ چاہے اضافت کے ساتھ ہوں یا ترتیب وار نیا ذائقہ ضرور فراہم کرتے ہیں۔ شاعری کے تراش خراش یا چھان پھٹک کرنے کا بھی پتہ چلتا ہے وہ جب بھی غزل کہتے ہیں تو لفظوں کو بار بار دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں اور بدلتے ہیں۔ انہیں اطمینان اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک مافی الضمیر سلیقے سے ادا نہ ہو جائے۔ اس چابک دستی سے شعر کے اندر چمک پیدا ہو گئی ہے۔ ان کے محسوسات کی دنیا وسیع ہے۔ وہ اپنے اندر جھانک کر دوسروں کے اندر کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔ اس لئے ان کا اپنا دکھ درد ماحول اور معاشرے کا دکھ درد بننے لگتا ہے۔ چنانچہ شعری اپیل ان کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ نئے انداز سے کوئی بات جب وہ کہتے ہیں تو روایت کا دامن مکمل طور پر نہیں چھوڑتے۔ ان کے یہاں روایتی عکس بھی دکھائی دیتا ہے۔ شاید ان کا سوچنا ہے کہ انحراف ضروری ہے لیکن مکمل انحراف مناسب نہیں ہے۔ ان کی دو غزلیں حاضر ہیں ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے!

امام اعظم

غزلیں

(۱)

قصور یہ ہے کہ لکھتا ہوں بار بار وہی
وہ حالِ دل ہے مرا تو ہزار بار وہی!

وہ زرد خوشبو یہیں پر کہیں کھڑی ہوگی!
یہ کس نے چھیڑ دیا قصۂ بہار وہی؟

یہاں کی مٹی مرے پاؤں کیوں نہیں کستی؟
وہی دریچۂ جاناں، دیارِ یار وہی

اُسے کہ شہرِ صدا میں بھی ہے سکوں کتنا!
یہاں تو غنچہ بھی چٹکے تو انتشار وہی

(۲)

آنکھوں میں آپ، آپ میں ہم، ہم میں زہر ہے
ہم جس کے معتکف ہیں، ہمارا ہی قہر ہے

چہرہ تو صرف چاند کا میلا ہوا مگر
بے نوریاں سنبھالے ہوئے شہر شہر ہے

کل میرے سارے خواب لہو روئے تھے جہاں
اب اُس جگہ یہ سُرخ گلابوں کا شہر ہے

اس وقت کچھ ہے، شام کو کچھ، رات کو کچھ اور
شاہد، یہ کوئی دھوپ نہیں، رنگ دہر ہے

جاوید اختر چودھری، برمنگھم

پاسباں لفظوں کی حرمت کے

میں اک ڈربہ نما کمرے میں بودوباش کرتا ہوں
میں اپنے ہاتھ سے رکھی ہوئی چیزوں کو اکثر بھول جاتا ہوں
میں دن بھر کی تھکن جب دور کرنے کیلئے بستر میں جاتا ہوں
لباسِ شب خوابی پہنتا ہوں
میں اپنے سر سے جب چپکی ہوئی وگ کو ہٹاتا ہوں
الگ کرتا ہوں آلات سماعت کو میں اپنے کانوں سے
پرے کرتا ہوں عینک کو میں جب بے نور آنکھوں سے
بہت مغموم ہوتا ہوں۔
ڈبوتا ہوں کسی محلول میں مصنوعی دانتوں کو
بگڑ جاتا ہے چہرہ آئینے کے سامنے آکر
مجھے بیتے ہوئے ایام پھر سے یاد آتے ہیں
تو جیسے آئینہ کوئی چیخ کر ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر بھی۔ خدا کا شکر ہے
کہ اس نے باقی رکھی ہے
میرے ہاتھوں کی طاقت اور حرمت بھی قلم کی
مرے مالک ـــــــ
مجھے مہلت بھی دینا تو
مجھے توفیق بھی دینا
کہ میں تیری امانت کو
حوالے ان کے کر جاؤں
کہ جو ہیں پاسباں لفظوں کی حرمت کے
مگر ہرگز نہ اُن کے
کہ جو الفاظ کو تیر وتفنگ کی شکل میں ڈھالیں
اور پھر خلق کے درپے آزار ہو جائیں!

سید احمد شمیم، جمشید پور (جھارکھنڈ)

سفر اندھی دشاؤں کا

بہت بے چین لمحے تھے
بہت گہری اُداسی تھی
یہی لگتا تھا
گہری جھیل میں اب ڈوب جانا ہے۔
نواحِ قلب میں جھانکا
خود اپنی ذات میں بیٹھا
دریچے ہو گئے روشن
صدا یہ دور سے آئی
''سخن کو کیوں سخن جانو؟''
کھلیں آنکھیں تو یہ جانا
سفر اندھی دشاؤں کا
کہاں منزل دکھاتا ہے؟
کہاں سورج اُگاتا ہے؟

آج کے تناظر میں اردو کی خدمت کے ذریعہ ہی اپنی تہذیب وثقافت کو محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ''تمثیلِ نو'' کی گراں قدر خدمات کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

محبوب احمد خاں

(راجد امیدوار، کیوٹی، دربھنگہ)

اردو ایک خالص ہندوستانی زبان ہے۔ اسے تعصب کی نظر سے مت دیکھئے اس کی حلاوت اور شیرینی سے لطف حاصل کیجیے۔ تمثیل نو ایک ادبی رسالہ ہے۔ مبارکباد!

ادریس پرویز (ایڈووکیٹ)

پروفیسر شاکر خلیق، در بھنگہ (بہار)

شہر خموشاں

اے شہر خموشاں یہ تو بتا
کیا تیرے یہاں بسنے والے
سب گونگے بہرے ہوتے ہیں
ہر سمت عجب خاموشی ہے
ہر سمت عجب سناٹا ہے
ان کچی پکی قبروں میں
کن کن لوگوں کا مسکن ہے
نادار بھی دولت والے بھی
خود دار بھی عزت والے بھی
کچھ لوگ سیاست والے بھی
پرزور خطابت والے بھی
یہ سب کے سب خاموش ہیں کیوں
کس نیند میں ہیں مدہوش ہیں کیوں
اسباب طرب ان کے ہیں کہاں
وہ غیض وغضب ان کے ہیں کہاں
کچھ محلوں میں بسنے والے
کچھ کٹیوں میں رہنے والے
اب سب کا ٹھکانا مٹی ہے
ہر خواب سہانا مٹی ہے
سب آئے خالی ہاتھ یہاں
کیا لے کر آئے ساتھ یہاں
اب عالم ہا و ہو چھوٹا
اب موسم رنگ و بو چھوٹا
یہ ایک مقام حیرت ہے
یہ ایک مقام عبرت ہے
اے شہر خموشاں یہ تو بتا
یہ تیرے مکیں کس حال میں ہیں
جنت کی ہوائیں کھاتے ہیں
یا دوزخ کے جنجال میں ہیں
اے کون و مکاں کے مالک سن
میں دست دعا پھیلاتا ہوں
تو رحم و کرم کا منبع ہے
تو مالک کل تو مولا ہے
سب ادنیٰ ہیں تو اعلیٰ ہے
تو بخش دے خاک مکینوں کو
تو بخش دے زیر زمینوں کو
اس ماہ مبارک میں مولا
رحمت کا سایہ ہو سب پر
اور کملی والے کے صدقے
ہم سب پہ نگاہ لطف و کرم

❀❀❀

سلطانہ مہر، امریکہ

کبھی کبھی

اے ابر باراں مجھ کو چھو جا/اور لے جا
میرے تن کی ساری خوشبو/اپنے ساتھ
اور میرے بچھڑے ساتھی سے کہنا
پردیس سے تجھ کو کیوں راس آیا!/دیکھو
ننھی منی بوندیں/یہ ہیرے موتی
یہ شبنمی آنسو/یہ سب تم سے دوری کی ہیں سوغات
اے ابر باراں/ان سے یہ بھی کہنا کہ
کبھی کبھی یہ دوری/ابر نیساں کی بجائے
خشک سالی بھی لاتی ہے/کوکھ کے ساتھ
وہ ارمانوں کی وادی کو بھی/بنجر کر جاتی ہے!

ڈاکٹر حنیف ترین عرعر شمال (سعودی عربیہ)

حمد

سلگتی ریت پر صحرا میں کوئی
ہے مصروف عبادت دُھوپ اوڑھے
عقیدت میں بگولے ناچتے ہیں

نعت

کتنے انسان سکون پانے کو
سبز گنبد سے لپٹے رہتے ہیں
ابر رحمت برستا رہتا ہے

گھر کا شور

کون؟ کیوں؟ کہاں؟ کیسے
اُس کے اِن سوالوں سے
گھر میں شور رہتا ہے
قربتوں کی خوشبو کا
آبشار بہتا ہے!

اس کا ساتھ

تب نہ ساتھ نکلے وہ
گھومنے کو بستی میں
جھومنے کو مستی میں
راستہ ڈسے مجھ کو

امید ایک پھل ہے

سنو! امید ایک پھل ہے
جو کڑوا بھی ہے شیریں بھی
اسی کے ذائقے سے ہے
روانی خونِ انساں میں
یہ مستی بزمِ امکاں میں

ڈاکٹر پنہاں، امریکہ

زندگی کا سفر

نیند میں چلنے کی بیماری
اور خوابوں میں سفر کرنے کا مرض عجیب ہوتا ہے
زندگی بھی ایسا ہی ایک عجیب سفر ہے
فلسفے کی چھڑی، سائینس کی جوتی، مذہب کی چادر
اور انسان کے بہتر مستقبل کے خوابوں کی گٹھری زادِ راہ
دل کا قطب ستارہ منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے
جس کی دلکشی بوڑھے ارادوں کو بھی جوان رکھتی ہے
اور روزِ ازل سے دنیا کے میلے میں کھویا ہوا یہ بچہ
بھیگی پلکوں اور مسکراتی آنکھوں والا معصوم وحیران
میری ذمہ داری ہے
میرا فرض اس کی منزل کی تلاش ہے
اور انتظار اس وقت کا ہے
جب اس طفلِ ناداں کی رسائی بلوغتِ فکر ونظر تک ہو جائے
اور تمیز خیر وشر اس کی نیت اور ارادوں سے ظاہر ہونے لگے
تب میں اپنے خوابوں کی گٹھری سے
ساری تعبیریں اسے سونپ کر سبک دوش ہو جاؤں گی
اس وقت تک
میری انجان منزلوں کو میرا انتظار کرنا ہوگا
لو پھر وہی سوال کہ میں کون ہوں؟
اری اندھی نگری
تو اب بھی مجھے پہچان نہیں سکی
میں زندگی ہوں۔
اور اس بچے کا نام اشرف المخلوقات ہے

ش م عارف ماہر آروی، آرہ

مقدر

مقدر ہے ایک بازی گر
ممکن ہی نہیں ہے اس سے مفر
ہر ایک کی ہتھیلی پہ ہیں
اس کے نشاں
ہنستا بھی ہے وہ
رلاتا بھی ہے
اور آبلہ پا چلاتا بھی ہے
ہوگا کیا کب کس کو خبر
مقدر کے آگے سب بے بس
کہ ہے وہ ایک بازی گر
ممکن نہیں ہے اس سے مفر!

❀❀❀

سید جعفر امیر، امریکہ

قطعہ

اپنی تہذیب و تمدن نہ زباں کو بھولو
ملّت و قوم و وطن کو نہ مکاں کو بھولو
پہلی برسات کی خوشبو، وہ ہواؤں کا خروش
اپنے بچپن کی نہ یادوں کے جہاں کو بھولو

فریدہ فرحؔ لاکھانی، سڈنی (آسٹریلیا)

باغباں پھر چمن پہ اترایا ہے
وراثت میں کلی نے پھول پایا ہے
محبت کی اور کیا مثال دیں ہم آپ کو
بھنورے کو بلا وجہ کسی پہ پیار آیا ہے

تاج ہاشمی، بسنت، دربھنگہ

تین نظمیں

نفس نفس
ساعات گزراں
وقت
مسلسل جاری
آمد و شد کا
عمل
سن و سال
زندگی
گزر بسر
کئی طریق کار
مختلف نہج پر گامزن
بخیر طے ہو یا خدا
صبح و شام
یہ سفر
اچھا کام
بھلا ہو سب کا
یہی سدا امن
رہے دھیان
کہ چنتن وان
اسی میں نیہت
تیرا اپنا بھی کلیان!

راز سیوانی، سیوان

ایک نظم

برسوں پہلے دیکھا تھا
گلشن محبت میں
کھلا کھلا سا ایک پھول
جوہی، چمیلی سے سوا
نسترن سے مختلف
سروسمن سے بھی جدا
رنگ وخوشبو سے بھرا
خوش قبا گلاب سا
مثل چہرۂ دل رُبا
اب نظر نہیں آتا
ملیح حسن بے بہا
لیکن در خیال پر
دبے پاؤں وہ آتا ہے
تصورات جسم و جاں
خوشبوؤں سے بھرتا ہے!

سید مظفر شعیب ہاشمی، آئی جی پولس (ویکر سیکشن)، پٹنہ

ایک التجا

میری چھت رہنے دو
میرا آسمان لے لو
میری ایک گمٹی ہے
جو بہت ہی چھوٹی ہے
چند مشینیں ہیں اس میں
اور ہیں چند اوزار
میں چپیاں چپکا رہا ہوں
ٹائر میں
اور جوڑ رہا ہوں اینٹیں
مضبوط کررہا ہوں
ملک وقوم کی دیوار
اسے مت پھونکو
اسے مت جلاؤ
میری گمتی رہنے دو
میرا جہان لے لو
میری چھت رہنے دو
میرا آسمان لے لو!!

غزلیں

عبدالعزیز خالد، لاہور (پاکستان)

ہے تماشا گاہِ نیرنگِ جہاں ہفتِ نظر
حد کوئی عائد نہیں گل چینی و گلگشت پر
رزق بن جائے رگِ جاں کا رمِ موجِ ہوا
اضطرابِ موج آخر کار ہو محوِ گہر
کاوِ کاوِ دیدہ و دل سے اگر فرصت ملے
ہم بھی دل جمعی سے کرلیں کوئی دم عرضِ ہنر
مثلِ خسرو: نا تمام، ناتمام، ناتمام، ناتمام!
ہو نہ نذرِ نا تمامی میں یہ عمرِ مختصر؟
سر بریدہ، تن دریدہ، خاک و خوں پیراہناں
مثلِ حمزہ کے نہیں ہے کوئی جن کا نوحہ گر
خونِ مردانِ مبارز بے قصاص و بے دیت
کیا نہیں دنیا میں کوئی حق شناس و حق نگر؟
حاصلِ کارِ جہاں کیا ہے فقط بے حاصلی؟
صرف خاکستر ہے انجامِ تف و تابِ شرر؟
اپنے رب کے نور سے کب جگمگائے گی زمیں
امن کا گہوارہ، خالد، کب بنیں گے بحر و بر؟

منظر شہاب، جمشید پور

ہواؤں کا زور آزماتے رہے
سدا ہم پتنگیں اُڑاتے رہے
جنہیں جان و دل میں بساتے رہے
وہ رسماً تعلق نبھاتے رہے
مرے بعد بچوں نے اتنا کیا
مجھے چوکھٹے میں بٹھاتے رہے
وہ دشمن کے خیمے میں تھے مطمئن
عبث ہم لہو میں نہاتے رہے
بچے تھے وہ پتھر کی تھیں مورتیں
فضول آپ خنجر چلاتے رہے
کہانی تھی سادہ مگر کچھ تو تھا
زمانہ بضد تھا سناتے رہے
جنم سے ہی دانی ہیں منظر شہاب
گہر آنسوؤں کے لٹاتے رہے

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، لاتور، مہاراشٹر

دنیا ہی ہے تو دے دے، تو موت ہی کی چادر
چلنا سنبھل سنبھل کر، کھائیں گے ورنہ دھوکہ
بازارِ زندگی میں، ہیں جھوٹ کی ردائیں
ایسا نہ ہو کسی دن، دم گھٹ کے مر ہی جائیں
پیوندِ غم لگے ہیں، زخموں کے چھید بھی ہیں
ہیں کام دوسرے بھی، کب تک رفو کروں میں
بنتی ہے وجہِ ذلت، ہر پوششِ تکبر
چشمِ خدا میں مقبول! وقعت اسی کی ہوگی

یارب! نہ دے کسی کو، یوں بے کسی کی چادر
اوڑھے ہوئے ہیں رہزن، اب رہبری کی چادر
نایاب ہے اگر تو، ہے راستی کی چادر
اوڑھے رہو نہ ہردم سنجیدگی کی چادر
پھر بھی بری نہیں ہے، یہ زندگی کی چادر
رہ رہ کے ہے مسکتی، یہ زندگی کی چادر
وجہِ فروغِ عزت، ہے سادگی کی چادر
بے داغ جس کسی کی، ہے بندگی کی چادر

نادم بلخی، ڈالٹین گنج

کناروں کو اِسی کا غم بہت ہے
ندی سیلاب سے برہم بہت ہے
نچوڑا اس نے میرا خشک دامن
سمجھتا تھا اُسے وہ نم بہت ہے
مبرّا آدمیت سے وہ نکلے
جنہیں فکرِ غمِ آدم بہت ہے
ہوس والوں کی آسودہ متانت
زیادہ ہو کے بھی وہ کم بہت ہے
نہیں جو کاسۂ گل پاس رکھتا
زباں پر اس کی مدحِ جم بہت ہے
چمک باطن کہاں رکھتی ہے اس کی
بظاہر چیز جو چم چم بہت ہے
جہاں کچھ کم نہ تھا جشنِ مسرت
اُسی محفل میں اب ماتم بہت ہے
سنور کر بھی ہے برہم زلف تیری
ابھی موجود اس میں خم بہت ہے

ڈاکٹر سید محمد مثنیٰ رضوی، گیا

ساتھ دے گا نہ کوئی اب دلِ ناکام کے بعد
راہ دشوار ہوتی جاتی ہے ہر گام کے بعد
جانے کیوں بیٹھے ہیں رندانِ قدح خوار اب تک
اب دھرا کیا ہے یہاں دردِ تہہ جام کے بعد
بے کلی پہلے بھی کچھ کم نہ تھی دل کی یارو
اور بڑھ جاتی ہے دھڑکن مری اب شام کے بعد
ایک مُدّت ہوئی بچھڑے ہوئے تجھ کو لیکن
آہی جاتا ہے ترا نام مرے نام کے بعد
بے بسی اہلِ خرد کی کوئی دیکھے آکر
تیز ہے رقصِ جنون شدتِ آلام کے بعد
ساتھ تیرا تھا جو لے آیا یہاں تک ہم کو
ورنہ یہ کوس کڑے لگتے تھے ہر گام کے بعد

خورشید کاظمی، جموں

کسی سے بھی مجھے اب کوئی ڈر نہیں لگتا
یہاں مجھے تو کوئی بھی بشر نہیں لگتا
خزاں نے ایسی تباہی مچائی اب کے برس
کسی درخت پہ کوئی ثمر نہیں لگتا
ڑے ہی پیار سے وہ بات ہم سے کرتا ہے
وہ یوں تو لگتا ہے اپنا مگر نہیں لگتا
ہ میرے ساتھ رواں ہے مگر مجھے شک ہے
کسی بھی طور مرا ہمسفر نہیں لگتا
ہ مسکرا کے لپٹ جائے میرے سینے سے
وہ مہرباں ہو کبھی اِس قدر نہیں لگتا
ہاں میں اہلِ قلم کی کبھی نہ قدر ہوئی
ہماری بات کا کچھ ہو اثر نہیں لگتا
ں اپنے گھر ہی میں رہتا تو ہوں خورشید
الگ یہ بات ہے گھر اپنا گھر نہیں لگتا

سہیلؔ غازی پوری، کراچی

فکرِ غم بڑھ جائے تو اس کے مزے کچھ اور ہیں
یوں بھی روکھی روٹیوں کے ذائقے کچھ اور ہیں

حرف کا دامن سلگ اُٹھے گا تھوڑی دیر میں
خوش نما باتیں ہیں لیکن زاویے کچھ اور ہیں

جگنوؤ! زعمِ ہنر کرنے لگے ہو کس لئے!!
آسماں پر روشنی کے دائرے کچھ اور ہیں

آپ کتنا جانتے ہیں صاحب اعزاز کو
اب یہاں نقد و نظر کے مسئلے کچھ اور ہیں

جن پہ چل کر اور بھی دشوار ہو جائے سفر
یاد رکھئے اس طرح کے راستے کچھ اور ہیں

حاشئے پہلے بھی تھے دل کے ورق پر دوستو
اب جو ہیں لکھے ہوئے وہ حاشئے کچھ اور ہیں

آج کل وہم و گماں کے سلسلے ہیں یوں دراز
لوگ کچھ کہتے ہیں لیکن سوچتے کچھ اور ہیں

وہ کہ جن پہ عکس کم کم ہی ابھرتے ہوں سہیلؔ
کیا تمہارے پاس ایسے آئینے کچھ اور ہیں

انجینئر ہارون شامیؔ، لکھنؤ

ہر قدم پر اک نئی منزل سے وابستہ ہوا
دوسروں کے غم سے اپنے غم کا اندازہ ہوا

اک پرندہ ڈال پر بیٹھا تھا یوں سہما ہوا
جیسے دِل کے آئینے میں خواب اک ٹوٹا ہوا

اجنبی ہوگا تمہارے واسطے لیکن مجھے
بارہا اُس پہ خود اپنی ذات کا دھوکا ہوا

حادثے لمحہ بہ لمحہ رونما ایسے ہوئے
جاگتے لمحوں پہ بھی خوابوں کا اندیشہ ہوا

یہ وہی گھر ہے جہاں ملتی تھی دُنیا کو پناہ
اب اسی گھر میں نظر آتا ہوں میں سہما ہوا

میرے پیچھے ہیں ہزاروں سال کی پرچھائیاں
میرے آگے ہے مرا سایہ مگر سہما ہوا

'اُن کو چھت کی آرزو تھی' ہم کو دیواروں کی فکر
اِس طرح شامیؔ ہمارے گھر کا بٹوارا ہوا

حفیظ انجم، کریم نگر، آندھرا پردیش

یہ چاہتوں کی خطا ہے سزا ابھی تک ہے
مرے خلاف بنا مورچہ ابھی تک ہے

تمام رات ستاروں کی چاند کی مانند!
سنا ہے راتوں میں وہ جاگتا ابھی تک ہے

بلا کی تیرہ شبی میں بھی رہنمائی کو!!
مرے یقین کا جلتا دیا ابھی تک ہے

وہ دھول جھونکتا پھرتا ہے سب کی آنکھوں میں
نظر میں پھر بھی بنا پارسا ابھی تک ہے

زباں کا گھاؤ کبھی سوکھ ہی نہیں سکتا!
جو گھاؤ تو نے دیا تھا ہرا ابھی تک ہے

بدل چکا ہے یہاں آدمی ہی خو اپنی!!
مگر گلاب مہکتا ہوا ابھی تک ہے

درخت نیم کا لوری سنا رہا ہے مجھے!!
وہ میری آنکھوں میں سپنا بنا ابھی تک ہے

مرے خلوص کا قاتل ہے وہ حفیظ انجم
برائے نام بنا ہم نوا ابھی تک ہے

علیم صبا نویدی، چنئی

ٹھکرا کے کائنات جو گھر سے نکل گئے
وہ لوگ زندگی کے بھنور سے نکل گئے

آبادیوں نے پاؤں جو پھیلائے دشت سمت
خاموشیوں کے سانپ کھنڈر سے نکل گئے

ویرانیوں کو سونپ کے احساس کی گھٹن
ہم بھی حصارِ خوف و خطر سے نکل گئے

چکھ کر ہرے بھرے کئی لمحوں کا ذائقہ
منظر حسین کتنے، نظر سے نکل گئے

لے کر صباؔ نویدی نئی دھڑکنوں کی فوج
جس سمت روشنی تھی اُدھر سے نکل گئے

حباب ہاشمی، الہ آباد

غمِ دوراں سے جو فرصت ہو تو دِل شاد کریں
اک ذرا چین سے بیٹھیں تو تمھیں یاد کریں

دِل میں مُدّت سے نہیں ہے کسی خواہش کا گذر
اس خرابے کو بھلا کس طرح آباد کریں

دانہ و دام سنا ہے وہ نئے لائے ہیں
ہم بھی اب کاوشِ ناکامی صیّاد کریں

جو بھی حالات ہوں ہم اُن کے مقابل ٹھہریں
نامناسب ہے کہ ہم نالہ و فریاد کریں

ستم و جور کا انجام انہیں کیا معلوم!
جس قدر چاہیں وہ ہم پر ستم ایجاد کریں

آخری وقت ہے اب یادِ خدا کرلیں حبابؔ
وقت اب کم ہے نہ ہرگز اسے برباد کریں

عمران راقم، کولکاتہ

وہ بے وفا ہوا تو حیرت کی بات کیا ہے
توڑا جو آئینہ تو حیرت کی بات کیا ہے

ہوش و حواس کھوئے جس کے لئے اسی نے
پاگل سمجھ لیا تو حیرت کی بات کیا ہے

اس عہدِ بے وفا میں اپنا بنا کے اس نے
رسوا ہمیں کیا تو حیرت کی بات کیا ہے

سمجھا تھا جس کو میں نے اپنے بدن کا سایہ
مجھ سے جدا ہوا تو حیرت کی بات کیا ہے

کرتا ہوں یاد اس کو شام و سحر میں اب بھی
اس نے بھلا دیا تو حیرت کی بات کیا ہے

کہتے تھے لوگ جب تو کچھ بھی یقیں نہ آیا
گھر بار لٹ گیا تو حیرت کی بات کیا ہے

سادہ دلی نے تیری رکھا نہ کوئی شاہد
وہ جو مکر گیا تو حیرت کی بات کیا ہے

شبنم سے جل گئے ہیں راقمؔ یہ پھول پتّے
شعلوں سے گھر جلا تو حیرت کی بات کیا ہے

تسنیم فاروقی لکھنؤ

وجد فکر و عمل میں رہتا ہے
دل ہمارا غزل میں رہتا ہے
وقت اپنے عمل میں رہتا ہے
بے عمل آج، کل میں رہتا ہے
اُس کا یوں کائنات میں ہے وجود
ذائقہ جیسے پھل میں رہتا ہے
ہم نے دیکھا ہے رات کا آنسو
دو پہر تک کنول میں رہتا ہے
امن نے گھر بدل دیا اپنا
اب وہ جنگ و جدل میں رہتا ہے
کتنا شاہی ہے سیپ کا شجرہ
کیڑا موتی محل میں رہتا ہے
آپ کے انتظار میں تسنیمؔ
دھڑکنوں سے خلل میں رہتا ہے

آسیؔ رامپوری (یوپی)

ہوش میں آجا تو انساں خود سری اچھی نہیں
جو خدا سے دور ہو وہ زندگی اچھی نہیں
خود بخود پردہ اٹھاکر سامنے آجایئے
جو اندھیرے میں رہے وہ روشنی اچھی نہیں
وہ جو خود کو بھی نہیں ہیں جانتے پہچانتے
ایسے انسانوں سے ہرگز دوستی اچھی نہیں
ختم ہوجائے گی اک دن یہ تمہاری روشنی
عہدِ حاضر میں ادائے سامری اچھی نہیں
انجمن آرائی کا انداز ہونا چاہئے
نا شناسا لوگ ہیں جلوہ گری اچھی نہیں
حد سے آگے بڑھ رہے ہیں آپ کے ظلم وستم
چاہنے والوں سے اتنی دشمنی اچھی نہیں
تو ہی آسیؔ کا نگہباں ہے خدایا لاج رکھ
اُس میں ہر اک وہ کمی ہے جو کمی اچھی نہیں

نیاز احمد (سابق اے ڈی ایم) یابنۃ، مدھوبنی

مطلب ہماری باتوں کا سمجھا نہیں گیا
میزان پر خلوص کی تولا نہیں گیا
سورج نے آسماں سے بڑی کوششیں تو کیں
لیکن زمیں سے وہم کا سایہ نہیں گیا
ڈھونڈا گیا زمیں سے فلک تک اُسے مگر
آثار بھی تھے سارے، وہ دیکھا نہیں گیا
آئینہ ایک وہ بھی ہے فصل بہار کا
صحرا میں گرچہ آج تک دریا نہیں گیا
اک کاروانِ ہوش وخرد بھی تھا ساتھ ساتھ
دیوانہ اُن کی بزم میں تنہا نہیں گیا
ہے امتحانِ عشق پہ حُسن آج بھر مصر
اب تک سرِ غرور سے سودا نہیں گیا
سنگِ گراں کو راہ سے اپنی ہٹا بھی دے
اتنا طلب میں حوصلہ پایا نہیں گیا
اس نے اہتمام کیا تھا بہت نیازؔ
تجھ سے ہی کوئے یار میں ٹھہرا نہیں گیا

صابرؔ عظیم آبادی، کراچی

گلاب رُت میں فضا اور خوشگوار بنا
میں بے قرار نہیں ہوں تو بے قرار بنا
فصیلِ جسم پہ روشن چراغ کرکے کوئی
ہر ایک محفلِ انجم کو شاندار بنا
اَلم کی دھوپ میں پھرتا رہے گا یوں کب تک
خود اپنے آپ کو تُو شاخ سایہ دار بنا
اگر میں قطرۂ کم مایہ ہوں سمندر میں
کسی صدف کا مجھے درِّ آبدار بنا
یہ سارا کھیل تماشا ہے ختم ہونے کو
نہ اتنا اپنے فسانے کو طرح دار بنا
اگر ہے زندگی کرنے کا کچھ خیال تجھے
تو اپنے فن کے اصولوں کو پائیدار بنا
بکھر گیا ہوں میں برگِ گلاب کی صورت
مجھے بھی پلکوں سے چُن کر گلے کا ہار بنا
اُمنڈ کے آنے ہی والا ہے سیلِ غم صابرؔ
مدافعت کے لئے تو کوئی حصار بنا

رفیق شاہین، علی گڑھ

ایسا تو نہیں زخموں میں سوزش نہیں ہوتی
ہاں تم سے گلہ کرنے کی خواہش نہیں ہوتی
اک حادثے کی ضرب سے سب ایک ہو گئے
آپس میں آج کل کوئی سازش نہیں ہوتی
تصویر سنورتی ہے مصور کے لہو سے
تخلیق فقط حاصل کاوش نہیں ہوتی
شاعر تو خدا خود بھی ہے پھر کیسی یہ افواہ
شاعر کی خدا کے یہاں بخشش نہیں ہوتی
فنکار اگر ہے تو صداقت پہ اُتر آ
تمہید کی محتاج نگارش نہیں ہوتی
ہر سمت میں سیلاب ہے آدم کے لہو کا
اب بادلوں سے دھرتی پہ بارش نہیں ہوتی
سب یاد ہے کیا تم نے مرے ساتھ کیا ہے
اب تم سے ملاقات کی خواہش نہیں ہوتی
شاہین سرِ بزم گویّوں کو بتادو
آواز سے اشعار پہ پالش نہیں ہوتی

انجم سیوانی، سیوان

جبینِ ناز پہ رنگِ ستم بھلا نہ لگے
سیاہ داغ سفیدی پہ خوشنما نہ لگے
کہیں کہیں سے دُھواں اُٹھ رہا ہے رہ رہ کر
ابھی بھی آگ کا شعلہ بُجھا بُجھا نہ لگے
جنہیں عزیز ہے دنیا میں اپنی خودداری
سزائے موت بھی اُن کو کڑی سزا نہ لگے
ہر ایک ذرّے میں ہے جذب میرا خونِ جگر
مگر یہ صحنِ گلستاں ہرا بھرا نہ لگے
طویل راہ ہے رہبر بہت پریشاں ہیں
غبارِ راہ میں منزل کا کچھ پتا نہ لگے
اَنا بڑی ہے مگر قد بہت ہی چھوٹا ہے
یہی سبب ہے اُنہیں کوئی بھی بڑا نہ لگے
کہاں سے لاؤں فرشتہ صفت بشر انجمؔ
کوئی بھی شخص زمانے میں باصفا نہ لگے

پادری افضال فردوس، امریکہ

نہیں جو بھولتا وہ ہی مسلسل بھول جاتا ہوں
میں اپنے کل میں آج اور آج میں کل بھول جاتا ہوں
مجھے ہر بار صحرا کا سفر درپیش ہوتا ہے
مگر ہر بار میں پانی کی چھاگل بھول جاتا ہوں
منع کرتا ہوں لوگوں کو ہواؤں کے تعاقب سے
کبھی میں بھی ہوا تھا یونہی پاگل بھول جاتا ہوں
لئے پھرتی ہے آوارہ ہوا کتنے زمانوں سے
میں ریگِ دشت ہوں یا کوئی بادل بھول جاتا ہوں
کہاں تم نے اچانک راستہ اپنا بدل ڈالا
کہاں ٹوٹا تھا خوابوں کا تسلسل بھول جاتا ہوں
الجھ کر رہ گیا ہوں خارزارِ دین و دنیا میں
کہ تم کو یاد کرنا بھی مسلسل بھول جاتا ہوں
ترے ہرجائی ہونے کا یقیں اب تک نہیں آیا
تجھے کھویا تھا میں نے آج یا کل، بھول جاتا ہوں

ڈاکٹر مسلم شہزاد، نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن

میں خندۂ گل، خندۂ لب دیکھ رہا ہوں
ترکیبِ توازن میں ادب دیکھ رہا ہوں
افسوں، کہ کوئی صبحِ طرب دیکھ رہا ہوں
سایہ سا پسِ آخرِ شب دیکھ رہا ہوں
وہ کچھ نہیں کہ کر بھی بتا دیتا ہے سب کچھ
اس کا لب و لہجہ میں عجب دیکھ رہا ہوں
صد حیف، کہ اس صاحبِ اقدار سے مل کر
خود اپنا تہی دستِ طلب دیکھ رہا ہوں
ہاں، راس کل آجائے مروت یہ دگر بات
بروقت اُن آنکھوں میں غضب دیکھ رہا ہوں
دیکھوں کیا کسی ہاتھ میں کشکولِ گدائی
میں خانہ بدوشی کا سبب دیکھ رہا ہوں
شہزادؔ تری مہر و وفا پہ ہے مری آنکھ
شجرہ نہ تیرا نام و نسب دیکھ رہا ہوں

بیتابؔ، پیلی بھیتی، فتح پور

قدرت نے فضاؤں میں کئی رنگ بکھیرے
مل جائیں جو مجھ کو تری زلفوں کے اندھیرے
پھیلے ہیں ابھی راہوں میں ہر سمت اندھیرے
دے سکتے نہیں فیض کبھی اتنا سمجھ لو
دھوکے میں نہ آجانا سمجھ بوجھ کے چلنا
پڑ جائے نظر ان پہ تو جم جائے انہیں پر
ہم کو نہیں پہچانا تعجب ہے مرے دوست
جو دودھ پلائے اُسے ڈس لیتی ہے ناگن
یہ کیسا سفر کیسی یہ منزل ہے کہ بیتابؔ

کس کس پہ نظر جائے کہاں جا کے یہ ٹھہرے
قرباں میں کروں ایسے اندھیروں پہ سویرے
بیٹھے ہیں ابھی تاک میں بے رحم لٹیرے
سورج کی ضیا کے لئے جو چمکے ہیں سویرے
رہبر کی طرح ملتے ہیں راہوں میں لٹیرے
نظروں سے مری گزرے ہیں کچھ ایسے بھی چہرے
ہم وہ ہیں جو کرتے تھے تری گلیوں کے پھیرے
یہ بات سمجھتے نہیں معصوم سپیرے
ہر ایک قدم راہ زن ہر موڑ لٹیرے

حسیر نوری، کراچی

ہو جاتا ہے جو خواہش و ارمان کا دشمن
ممکن ہے کہ بن جائے وہی جان کا دشمن
بڑھتے ہوئے طوفان کا انجام یہی ہے
طوفان ہی بن جائے نہ طوفان کا دشمن
امروز کی صورت نہ بگاڑے کہیں فردا
بن جائے نہ آکر مری پہچان کا دشمن
یہ سب ہیں بدلتی ہوئی سوچوں کے کرشمے
یہ صبح کا سورج نہیں انسان کا دشمن
ظلمت کا ہے پروردہ تشدد کا امیں ہے
اک شخص ہے ہم بے سروسامان کا دشمن
حالات سے مرعوب کبھی ہو نہیں سکتا
دشمن کے لئے ہوں میں بڑی شان کا دشمن
الزام درندوں پہ نہ رکھو کہ حسیر آج
اس دور کا انسان ہے انسان کا دشمن

علاءالدین حیدر وارثی، دربھنگہ

بحرِ غم میں ڈوبنے والا صحیح تیراک ہے
ورنہ دریا کی سطح پر دیکھئے خاشاک ہے
دُھل گئی ساری کثافت اس کے دل کی دوستو
فرشِ دل پر بچھ گئی جس کے ردائے پاک ہے
سانحہ دیکھا نہ میں نے اب تلک ایسا کوئی
اس لئے تو آنکھ میری آج تک غم ناک ہے
ساری نرمی لے گیا وہ وقت کا سنگِ گراں
کل جو مائل تھا کرم پر آج وہ سفاک ہے
راست گوئی جرم ہے اس دور میں حیدر میاں
جھوٹ کا سودا کیا جس نے وہی چالاک ہے

عطاءالرحمٰن عطا، آرہ

اِدھر ہم گئے ہیں اُدھر ہم گئے ہیں
جہاں بھی گئے بے بصر ہم گئے ہیں
سمندر میں کیسے اُتر ہم گئے ہیں
بھنور سے نکل کر کدھر ہم گئے ہیں
سلگتی زمیں ہے کڑی دھوپ سر پر
صدا اُن کی سن کر مگر ہم گئے ہیں
یہ اُن کا کرم ہے کہ خوشبو کی صورت
فضاؤں میں ہر سو بکھر ہم گئے ہیں
جہاں صرف دولت ہی دولت پڑی تھی
وہاں بانٹنے سیم و زر ہم گئے ہیں
عطا ہم کو بھولے گا کیسے زمانہ
عجب کام دنیا میں کر ہم گئے ہیں

عظیم ہاشمی، بتیا (مغربی چمپارن)

دل سے اٹھا ہے دھواں، آنکھوں سے بادل برسا
اس کے آنچل میں اڈتا ہوا کاجل برسا
لے کے موسم کا سندیسہ ہوا آئی ہے مگر
ابرِ وعدہ ہے وہی آج بھی جو کل برسا
داغ دل، حسرت ایام، کہ ہو فکر بقا
زندگی میں جو نہ چاہا وہی ہر پل برسا
کوئی موسم ہو نہ پھیلا یا کبھی دستِ سوال
میرے آنگن میں ہوا جب بھی چلی پھل برسا
بھوک کی فصل اُگاتی ہے غریبی کی زمیں
آسماں تو کبھی روٹی کبھی چاول برسا
بھیگنے لگتی ہے ہر سانس تری خوشبو سے
جب کبھی تیرے خیالات کا صندل برسا
کپکپاتی ہوئی اک سرد سی تھی رات عظیم
اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا مخمل برسا

سیما عابدی، امریکہ

گھر ہی گھر کے دیئے بجھاتا ہے
یہ تعصب فقط رُلاتا ہے
آئینہ اپنا ہی دُشمن بن کر
چہرہ سچ کا مجھے دکھاتا ہے
کوئی تو بات اس میں ہے ایسی
جو میری روح میں سماتا ہے
سر دیا تو ملی ہے سرداری
کون سر پہ کسے بٹھاتا ہے
گھر کی تقسیم کا سوال ہے پھر
رُت کا عنوان یہ بتاتا ہے
بند کمروں میں پھرتے رہتے ہیں
شور و غل باہر کا ڈراتا ہے
فون پر پوچھ لی ہے خیریت
رشتے داروں سے اتنا ناتا ہے
سیما ہم خواب کس طرح دیکھیں
غم جو تعبیر کا ستاتا ہے

انور تلہری، شاہجہاں پور (یوپی)

طبیعتوں میں اگر سادگی نہیں ہوگی
چراغ دل میں کبھی روشنی نہیں ہوگی
نجانے اپنے مقدر میں اور کیا ہوگا
اگر نصیب میں دیوانگی نہیں ہوگی
فریب دے گی کسی دن، یہ اس کی فطرت ہے
یہ زندگی تو کسی کی سگی نہیں ہوگی
پرائے درد سے جب تک نہ ہوگے واقف کار
برائے خانۂ دل، روشنی نہیں ہوگی
لہو سے سینچ لیا جائے گلشنِ ہستی
کہ یونہی شاخِ تمنا، ہری نہیں ہوگی
کبھی بھی پورا نہ ہوتا ہے قصدِ ناجائز
کسی کی دال کہیں بھی گلی نہیں ہوگی
ہے اپنی بات حقیقت پہ مشتمل انور
بُری لگے گی تمہیں پر بُری نہیں ہوگی

رشیدہ عیاں، امریکہ

جب کبھی کوئی قدم، میں نے بڑھا کر رکھا
اُس نے اک سنگِ گراں راہ میں لاکر رکھا
گو عنایات کی بارش میں بھگویا، لیکن
حق تو یہ ہے، کہ مرا حق نہ برابر رکھا
ورقِ زیست پڑھے، میرے کتابوں کی طرح
اپنا دیباچۂ ہستی بھی چھپا کر رکھا
اختیارات رکھے اپنی ہی تحویل میں سب
مجھ کو تصویر کی مانند سجا کر رکھا
صرف دہلیز کی عزت کی بقا کی خاطر
گھر میں جلتی رہی پر پاؤں نہ باہر رکھا
دھوپ میں چلتے ہوئے زاویے تبدیل کئے۔
اپنا سایا نہ مرے قد کے برابر رکھا

حسرت مونگیری، مونگیر

تمہارے دل میں کوئی زخم پک رہا تو نہیں
تمہاری آنکھ سے آنسو ٹپک رہا تو نہیں
بہت لطیف ہے کس کے بدن کی خوشبو ہے
کسی کے باغ کا غنچہ چٹک رہا تو نہیں
مرا نصیب پھر اک دن عروج پر ہوگا
اندھیری رات میں جگنو چمک رہا تو نہیں
مجھے سفر کی صعوبت کو جھیلنا ہوگا
تھکا تھکا سا یہ چہرہ جھلک رہا تو نہیں
برس رہے ہیں ادھر آسماں سے شعلے پھر
مری طرف کوئی شعلہ لپک رہا تو نہیں
یہ زندگی تو تمہاری عذاب تھی شاید
سکوتِ شب کا ستارہ چمک رہا تو نہیں
بتا رہا تھا کوئی راستہ خضرؑ بن کر
وہ اپنی راہ سے حسرت بھٹک رہا تو نہیں

غلام مصطفیٰ روحیؔ کٹیہاروی، سیوان

میں ہوں پیاسا مجھے پلا سائیں
تشنگی میری بھی بجھا سائیں
میکشی کا ادب نہیں مجھ میں
مجھ کو پینے کا ڈھب بتا سائیں
جام و مینا کی کیا ضرورت ہے
چشمِ مخمور سے پلا سائیں
راحتِ جاں، سکون دل میں نے
سب ترے نام کردیا سائیں
کوئی ہمدم نہیں جہاں میں مرا
بس ترا ہی ہے آسرا سائیں
ظلمتِ شب سے ڈر لگے ہے مجھے
اک دیا راہ میں جلا سائیں
اپنا جلوہ دکھا دے روحیؔ کو
رُخ سے پردہ ذرا اٹھا سائیں

افسر حمزہ پوری، گیا

کوئی نیا سا مصرعہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے
میر کے گھر کا نقشہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے
دھوپ میں چلتے چلتے میرے پاؤں کے چھالے کہنے لگے
کوئی سکوں کا لمحہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے
صغر سنی میں جس بچے نے دُنیا داری سیکھی ہو
ایسا کوئی بچہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے
وہ تو یقیناً کوئی وَلی ہے جس نے نبھا دی رسمِ وفا
اُس کے جیسا جذبہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے
طنز کے پتھر کھا کھا کر بھی اُف نہ کیا بس صبر کیا
میرے جیسا گُردہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے
میر کے لہجے کو کیا جانو میرِ سخنور میر تقی
افسر سا ہی لہجہ لاؤ، ایک غزل اور لکھنی ہے

مجاز نوری، دربھنگہ

بن کے نشتر دل میں اترے اور رگِ جاں ہو گئے
رفتہ رفتہ وہ مرے جینے کا ساماں ہو گئے
اک جھلک میں لٹ گیا آنکھوں کا سارا حوصلہ
رات ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئے
ہو سکے تو آ کے سلجھانے کی کوشش کیجئے
لیجئے ہم صورت گیسو پر پریشاں ہو گئے
آپ سے ملنے کی خواہش خود کو کھو دینے کی بات
کس طرح دو ایک افسانے کا عنواں ہو گئے
ایک مدت سے خموشی تم نے کی تھی اختیار
کس کی فرمائش پہ نوری تم غزل خواں ہو گئے

عارف شفیق، کراچی

عجیب لوگ ہیں مقتل کی سمت جاتے ہوئے
گذر گئے ہیں ہمیں آئینہ دکھاتے ہوئے
جو میرے نام کی دہشت سے کانپ جاتا تھا
وہ میرے پاس سے گذرا ہے مسکراتے ہوئے
اُسے خبر تھی کہ ہم لوگ بے گنہ ہیں جبھی
وہ رو پڑا تھا غلط فیصلہ سناتے ہوئے
زمین ماں ہے اسے کر رہے ہیں کیوں تقسیم
یہ کاش سوچتے ہم سرحدیں بناتے ہوئے
ہر آنے والا یہ چاہے کہ ابتدا سے سنے
مگر میں تھک گیا روداد غم سناتے ہوئے
یونہی گذر گئے عارف مجھے پچاس برس
ان آندھیوں میں لہو سے دیئے جلاتے ہوئے

شمس جلیلی (ایڈووکیٹ)، پورنیہ

ہے چٹختی ہڈیوں کا درد، دردِ لا دوا
بس خدایا، بس خدایا، بس خدایا، بس خدا
ذہن بیحد منتشر ہے اور اعضا مضطرب
ہر گھڑی ہے اک قیامت ہر گھڑی کرب و بلا
ہاتھ میں حرکت نہیں ہے پاؤں میں جنبش نہیں
کس طرح مسجد کو جاؤں کس طرح مانگوں دعا
درد سے تڑپا کروں میں اور تو دیکھا کرے
میں ترا بندہ نہیں کیا، تو نہیں میرا خدا؟
ہڈیوں میں درد بے حد اور یہ جان ناتواں
سن لے میرا نالۂ دل ورنہ لے مجھ کو بُلا
کیا وہی یہ شمس ہے جس کو نہ تھا دم بھر قرار
کام کی ہر دم لگن تھی اور تھا سیماب پا
تو کریم و کار ساز و خالقِ کون و مکاں
کام جو ممکن نہیں تھا وہ بھی تو نے کر دیا
تیری رحمت سے نہیں مایوس ہرگز دل کبھی
بس کرم کی آس میں ہے بندۂ عاصی ترا

شاذ رحمانی، کٹیہار

مزاج بدلا، فضائیں بدلیں
ہر ایک جانب ہوائیں بدلیں
بغور دیکھو نظر کی حد تک
زمانے کی اب ادائیں بدلیں
یہ کیسے جذبات دل کے بدلے
رواج بدلا، وفائیں بدلیں
یہ معجزہ وقت نے دکھایا
ستم گروں کی سزائیں بدلیں
عذاب ہر سو ہوا مسلط
شعور کی جب ردائیں بدلیں
مفاد کے اس جہاں میں اب تو
خودی کی اکثر قبائیں بدلیں
نشاط آگیں ہے شاذ لمحہ
عدو کی شاید دعائیں بدلیں

ڈاکٹر قمر رئیس بہرائچی، بہرائچ

دریا ترے خلوص کی پہچان ہو گئی
تشنہ لبی جب اپنی پشیمان ہو گئی

جب تیرگی پہ روشنی قربان ہو گئی
تصویر اپنی دیکھ کے حیران ہو گئی

کچھ رنگ روپ اور دکھائے حیات نو
مخلوق سادگی سے پریشان ہو گئی

جب جب بھی لوگ برسرِ پیکار آئے ہیں
راہِ حیات اور بھی آسان ہو گئی

خیمے لگے ہوئے ہیں فصیلوں پہ آج بھی
بستی وفا شعاروں کی ویران ہو گئی

وہ حسنِ اتفاق سے رستے میں مل گئے
مشکل بہت تھی راہ جو آسان ہو گئی

یارو جب آس ٹوٹ گئی انتظار کی
تصویرِ یار میری نگہبان ہو گئی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ترانہ

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

نیشنل اُردو یونیورسٹی جس کا نام نامی ہے
جس میں شامل مولانا آزاد کا اسمِ گرامی ہے
نور کا اک گہوارہ ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

جس سے ملک کا نام اونچا ہے، ایسا اک شہ پارہ ہے
جس کو دیکھ کے سب کہتے ہیں نور کا اک مینارہ ہے
علم و ادب کا یہ مرکز ہے، فن کا یہ گہوارہ ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

ہندوستان کے ہر باسی کی ہمت اس میں شامل ہے
ہمت میں حرکت ہوتی ہے حرکت اس میں شامل ہے
مولانا آزاد کے نام کی برکت اس میں شامل ہے
نام بھی اس کا دل کو کھینچے کام بھی اس کا پیارا ہے
اسی لئے تو یہ دانش گہہ سب کی آنکھ کا تارا ہے
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

اُردو جو ہے پیار کی بولی تو اُس کے ارمان بھی دیکھ
یورپ اور عرب تک پہنچی ہے تو اس کی شان بھی دیکھ
امریکہ اور کینیڈا پر اُردو کے احسان بھی دیکھ
اُردو اک تہذیب کا نام ہے اس تہذیب کی آن بھی دیکھ
ہندوستان کی شان بھی دیکھ

ایسی ایک زبان ہے اُردو
ہندوستان کی جان ہے اُردو
سارے ملک کی شان ہے اُردو

نام بھی اس کا دل کو کھینچے کام بھی اس کا پیارا ہے
اسی لئے تو یہ دانش گہ سب کی آنکھ کا تارا ہے

نیشنل اُردو یونیورسٹی جس کا نام نامی ہے
جس میں شامل مولانا آزاد کا اسمِ گرامی ہے
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
نور کا اک گہوارہ ہے
سب کی آنکھ کا تارا ہے

بہ شکریہ: اُردو یونیورسٹی نیوز میگزین (مانو) حیدرآباد، دسمبر ۲۰۰۲ء۔

تشنہ اعجاز، خیرآباد پوسٹ بگہا، مغربی چمپارن، بہار

مکالمہ مدیر کے ساتھ

''تمثیل نو'' اپریل تا ستمبر بھرپور اور جاندار ہے۔ یہ رسالہ دنیائے اردو میں۔ بطور۔ گل بدناں وسیم تناں۔ پری پیکر۔ لالہ رخسارے۔ سراپا آفت دل۔ لئے نئے آب وتاب کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ آزاد غزل پر مظہر امام صاحب کی تحریر عمدہ ہے۔ مجھے ان کے نثری اسلوب پڑھ کر ایک کیف محسوس ہوا۔ ڈاکٹر امام اعظم صاحب گستاخی معاف! آج کل اُردو میں جو شاعری کی جارہی ہے یا تنقیدیں کی جارہی ہیں یا افسانے لکھے جارہے ہیں۔ بیشتر ایسی چیزیں اب قاری کو پڑھنے کو مل رہی ہیں قسم اللہ کی۔ جس سے قاری کی میا مری جارہی ہے۔ کچھ تو مدیران محترم سے ذاتی تعلقات ہونے اور کچھ یہاں وہاں سے اِدھر اُدھر سے جوڑ توڑ کر کے رسائل و جرائد میں چھپ رہے ہیں۔ بعض ہائے میرے اللہ۔ میں مرجاؤں گی دیکھئے نا۔ ذرا زور سے بولئے نا۔ آپ کی آواز میں کتنی کشش ہے اس جادوئی اور نقرئی آواز کو سن کر بہت سے مدیر اپنی عمر رفتہ کی پرواہ کئے بغیر ہر طرح اولیت فوقیت دیتے ہیں اللہ کا کرم ہے کہ آپ اس سے مبرا ہیں۔

میرے محترم! مدیران گرامی کو اردو کے بیشتر قاری کا بھی لحاظ رکھنا ہے جو دور دراز سے کرایہ خرچ کر کے شہر کے مختلف رسائل و جرائد کے حصول کے لئے آتے ہیں انہیں تازہ شمارہ مطالعہ کرنے کی ایک لت ہے۔ ایک نشہ ہے۔ جب قاری رسالے کا مطالعہ کرتا ہے اور بھرتی کی شاعری۔ دیگر سطحی چیزیں دیکھتا ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ بہت سی ایسی تخلیقات اب اردو کے جرائد ورسائل میں آرہی ہیں جنھیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ تخلیق کار سخت پریشانی۔ کسی شدید رنج وغم ایک انجانے سے خوف ''ذہنی انتشار شدید کرب والم۔ رنج وغم میں ہے۔ آپ کو شاید یہ نہ معلوم ہو کہ ایسے آثار وافکار والے اصحاب کو فن طب میں مبتلائے مالیخولیا کہتے ہیں۔ اس مرض کے شکار اشخاص کے افعال دماغی بگڑ جاتے ہیں۔ ذہن اور فکر باطل ہو جاتی ہے۔ مراق۔ قطرب۔ مانیاداء الکلب۔ رعونت۔ حمق۔ اور عشق۔ اس کے مختلف اقسام ہیں۔ اطبائے مالیخولیا کے معنی۔ کسی انجانے خوف۔ ڈر کے بتائے ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم صاحب برا نہ مانیں ایسے ہی امراض و آثار کے مبتلا حضرات کی تخلیقات آج اردو کے بیشتر جرائد ورسائل میں چھپ رہی ہیں۔ آج کی تنقید۔ تنقید نہ ہو کر تنقیص۔ ہوا کرتی ہے۔ تنقید کیا کرتے تھے۔ مجنوں گورکھپوری، رشید احمد صدیقی اور ماہر القادری، اندر سنگھ ورما کا آپ کے ساتھ مکالمہ نہایت محنت سے لکھا گیا ہے۔ مگر موصوف اعتدال پسندی کی جگہ انتہا پسندی پر اتر آئے ہیں۔ علامہ اقبال کی شخصیت کے تاریک پہلو کے نکات وجہات۔ شہود و مشہود جو دور سے لائے ہیں۔ یہ بات ورما صاحب کے کثرت مطالعہ کا پتہ دیتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کثرت استعمال سے ذہن و دماغ میں بھی کجی۔ لاغری و تیز حاپن آجاتا ہے۔ ہر انسان کی شخصیت کے دو پہلو ہوتے ہیں خیر اور شر۔ اگر کسی کی شخصیت میں خیر تلاش کیا جائے تو خیر ہی نظر آئیگا اگر شر تو شر ہی نظر آئے گا۔ پچھلے دنوں گورکھپور

میں قبلہ ڈاکٹر احمر لاری کے ساتھ ان کی رہائش گاہ ادبستان میں حاضر تھا۔ انہوں نے فرمایا کہ تحریک پاکستان کا ذمہ دار جو علامہ اقبال کو بتایا جاتا ہے یہ غلط ہے۔ الہ آباد میں کسی ادبی سرکل میں اس کی بحث چلی تھی تو وہاں منشی پریم چند کے پوتے جن کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے نے بتائی اپندر ناتھ اشک کے صاحبزادے نیلابھ نے اس کی تصدیق کی۔ اس پر آج کل ڈاکٹر احمر لاری مختلف جگہوں سے شواہد جمع کر رہے ہیں دور دور کی لائبریریوں سے بھی استفادہ کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر کچھ کتابیں وہ پاکستان سے بھی منگوا رہے ہیں۔ یہ محنت ڈاکٹر احمر لاری اس لئے کر رہے ہیں کہ اس پر تاریخی و تدقیقی شواہد حاصل کر کے ایک مفصل مضمون کسی مشہور جریدے میں لکھیں۔ مظفر شعیب ہاشمی صاحب کی کہانی پرور ما صاحب کا تبصرہ۔ تعصب کی عینک سے دیکھ کر کیا گیا ہے۔ بہت پہلے ایک کہانی 'پروین' ہر چرن چاولہ کی روبی میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے چاؤلہ صاحب کو لکھا کہ پروین کے کردار سے ایک خاص طبقے کی دل شکنی ہوتی ہے۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ بھائی تشنہ پروین کسی بھی گھر میں ہو سکتی ہے۔ اس میں ذات و مذہب کی قید نہیں ہے اصل مقصد اس کہانی میں دیئے گئے مقصدیت اور پیغام سے ہے۔ اگر جمال نمرتا سے بوس و کنار کرتا ہے۔ تو یہ بشری تقاضے کا خاصہ ہے۔ مگر جمال کی اس خوبی کو یکسر نظر انداز کر گئے کہ دعوت گناہ کے وقت جب کہ موقع بھی ہے، رسم دنیا بھی ہے موسم کا تقاضا بھی ہے۔ اس وقت جب اس کے جذبات برانگیختہ ہو جانے چاہئیں وہ سنبھل جاتا ہے۔ راہ مستقیم کی راہ کو پسند کرتا ہے۔ وہ اس پر غور نہیں کرتے۔ خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہئے۔ اسلام نے اسی لئے پردے کا حکم دیا ہے عورت کے معنی پردے میں چھپا کر رکھنے والی چیز کو بھی کہتے ہیں۔ عریاں جسم اور اس کی کھلی ٹانگوں کی بیچ سے جھانکتی ہوئی شرم گاہ کے تصور سے جلق لگا کر تلذذ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ابکائی آجاتی ہے اور طبیعت مباشرت و ہمبستری کے لئے راضی نہیں ہوتی۔ اگر وہی عورت پردے میں ہو اور اس کے اندر خاموشی ہوگی تو طبیعت راغب ہوگی! دراصل ہر آدمی کو اپنے نظریے کی بصارت سے تصویر نظر آتی ہے۔ جیسے ایک صاحب دوران ہمبستری۔ اپنی معشوقہ سے وفور جذبات میں کانپتی آواز میں کہنے لگے۔ جانم تم نے مجھے جو جنسی تجربے دئے ہیں جو مجھے جنسی آسودگی دی ہے یہ میری زندگی کے لئے نعمت ہے میں چاہتا ہوں تم سے ہمبستری کروں تو اس وقت تمہارا شوہر بھی میرے سامنے ہو مجھے ایک الگ قسم کا کیف محسوس ہوگا۔ معشوقہ نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے کل شب تم گھر آجاؤ۔ وہ صاحب وقت مقررہ پر اپنی محبوبۂ دلنواز کے گھر آ گئے۔ اس عورت نے انہیں کسی کونے کھدرے میں چھپا دیا۔ چاندنی رات تھی بیوی نے اپنے شوہر کے دل و دماغ پر اپنی محبت کا اثر جمانا شروع کیا ایک بوسہ لیکر گلے میں بانہیں ڈال کر کہا کہ میری دلی خواہش ہے کہ سامنے اس کھجور کے پیڑ پر چڑھوں کاش میری یہ دلی تمنا پوری کرا دو۔ شوہر نے رضامندی جتاتے ہوئے محبت کے جواب میں بیوی کو بدقت تمام کھجور کے پیڑ پر چڑھا دیا۔ بیوی پیڑ پر چڑھتے ہی ایک ہاتھ سے سینہ پیٹنے لگی اور ہائے مار کر کہنے لگی۔ ہائے تیرا ناس ہو تو یہ کیا کر رہا ہے۔ شوہر بولا میں تو یہاں کھڑا ہوا کچھ نہیں کر رہا ہوں عورت بولی تو کسی پرائی عورت سے ہمبستری کر رہا ہے ہائے ہائے میں مر جاؤں اور رونے لگی شوہر لاکھ قسمیں کھائے جا رہا ہے بیوی نہیں مانی بمشکل اتری شوہر سے بولی تم نے یہ کیا۔ شوہر بولا! ذرا میں چڑھ کر دیکھوں۔ وہ بدقت تمام کھجور کے پیڑ پر

چڑھا بیوی نے ادھر اپنے عاشق کو بلا کر ہمبستری کی دعوت دے ڈالی۔ شوہر نے جو یہ منظر دیکھا تو بولا تو کیا کر رہی ہے۔ یہ کون ہے عورت بولی کوئی تو نہیں شوہر نے کہا مجھے ایسا نظر آ رہا ہے اور وہ جب تک بدقت تمام اترے تب تک عاشق شاد کام ہو کر شربت وصل پی کر جا چکا تھا۔ دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جو دیکھا کہنے لگے۔ شوہر بولا کمال ہے یہاں کچھ اور منظر ہے درخت پر کچھ اور منظر پھر دونوں بولے یہ درخت ہی ایسا ہے اس پر چڑھنے پر ایسا ہی کچھ منظر سامنے آتا ہے۔ شاید ورما صاحب کو ایسا ہی نظر آیا ہو۔ ٹانگیں کھلی ہوئی ہوں یا بیچ سے جھانکتی ہوئی شرمگاہ ہو یا ادھ کھلے پستان ہوں طبیعت راغب نہیں ہو پائیگی۔ آج یورپ میں ننگی ٹانگیں اور ادھ کھلے پستان کی اہمیت ختم ہو گئی ہے وہاں اب ہم جنسی نے جگہ لے لیا ہے۔ وہاں ہم جنسی کی باقاعدہ تنظیمیں بھی ہیں۔ ''اس کو...... گے۔ تحریک کہتے ہیں۔ دراصل پردے میں ہی رکھی چیز پر طبیعت مائل ہوگی سرشت انسانی ہے جس چیز کو انسان کو کرنے سے منع کر کے تاکید کی جائے گی کہ تم یہ نہ کرو تو اس سے یہی خطا سرزد ہوگی۔ آدم سے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم گندم نہ کھاؤ انہوں نے کھالیا۔ ورما صاحب کا کہنا کہ مدرسوں میں شروع سے بچوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے یہاں اکثریتی فرقے کے ساتھ جنگ جاری رہے گا تاوقتیکہ اسلام غالب آ جائے۔ یہ اتہام اور الزام ہے۔ میں بھی مدرسے سے جڑا ہوں بہت سے مدارس کی دیکھ ریکھ احقر کے ذمے ہے۔ ورما صاحب جیسے بالغ نظر اور اعلیٰ منصب پر رہنے والی ہستی سے اتنی بے جان اور غلط بات سن کر دل پارہ پارہ ہو گیا۔ وہ خود مدارس میں جا کر بیٹھ کر طلبا اور اساتذہ سے مل کر اندازہ لگالیں۔ مدارس میں ہمارے بہت سے غیر مسلم بچے بھی پڑھتے ہیں ہمارے ہندو بھائی غریب نادار بچوں کی امداد بھی کرتے ہیں۔ بعض گھرانے یتیم بچوں کو پابندی سے کھانا کھلاتے ہیں دراصل فرقہ پرستی کی آگ ورما صاحب جیسے پڑھے لکھے اعلیٰ مدارج والے لوگ ہی لگاتے ہیں۔ کیا کیجئے۔ فرقہ پرستی کی ایک ذہنیت ہی بن گئی ہے۔ جب تاج محل کو ونئے کٹیار صاحب تیجو محل۔ کہیں۔ دلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کو مسٹر پی این اوک بلراج مدھوک پروین توگڑیا صاحب مہاراجہ آشوک کا مندر اور قلعہ کہیں۔ مظفر نگر میں عمرانہ کیس پر میڈیا نے کتنے کیچڑ اچھالے۔ مختلف ٹی وی چینلوں نے دن رات ایک کر دیا۔ مگر بھرتپور کی ۳۴ سالہ تارا کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے اس پر میڈیا اور انتظامیہ نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ تارا کا معاملہ اس لئے اہم ہے کہ اس کی ساس نند اور خسر نے مل کر تارا کو مجبور کیا کہ جب تمہارے شوہر سے تم کو کوئی سنتان نہیں ہو رہا ہے تو دیور جگن ناتھ کے ساتھ ساتھ دوسرے مردوں سے ہمبستری کر کے اولاد پیدا کرو۔ یہ سلسلہ پندرہ برسوں سے چل رہا تھا اس نے تنگ آ کر اس معاملے کی شکایت پولیس آفیسران سے کی جب بچہ پیدا نہیں کر سکی تو تارا کو گھر سے نکال دیا گیا۔ تارا مقامی پنچایت میں گئی تو پنچوں نے کہا کہ سسرال والوں سے سمجھوتہ کر لو۔ مجبوراً تارہ اپنے بھائی کے ساتھ بچھا چی گاؤں میں رہ رہی ہے۔ اس نے بھرتپور ضلع کے سیوار پولیس تھانے میں اپنے شوہر اور سسرال والوں کے خلاف رپورٹ درج کروائی ہے۔ ورما صاحب کو معلوم ہو کہ اسلام تعصب اور فرقہ پرستی کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ اسلام مساوات بھائی چارگی امن آشتی کا پیغامبر ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایک غیر مسلم لڑکی ایک بچے کو گود میں لے کر حاضر ہوئی کہ میں عیسائی دھرم کے ماننے والی ایک تہطی لڑکی ہوں مجھے انصاف چاہئے آپ کے

لڑکے ابوشحمہ نے میرے ساتھ غلط سلوک اور معاملہ کیا جس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے دور فاروقی ہے آپ دیکھیں کہ حضرت عمر ایک باپ ہیں مگر اپنے ہاتھوں سے اپنے کنوارے لڑکے ابوشحمہ کو سو درّے لگاتے ہیں ابوشحمہ کی موت ہوگئی۔ شیر شاہ کی ہندوستان میں حکومت ہے اس کے شہزادے شام کے وقت ہاتھی پر دوستوں کے ساتھ سوار ہو کر سیر و تفریح کے لئے نکلتے ہیں راستے میں ایک ہندو بنیا کا گھر ہے اس ہندو بنیے کی جوان اور خوبصورت بیوی غسل کر رہی تھی ہاتھی پر سے بنیے کی جوان خوبصورت بیوی کے ادھ ننگے جسم پر نظر پڑی شہزادے نے جو کہ پان کی گلوری منہ میں دبائے ہوا تھا اس عورت کے ننگے جسم پر پان کی پیک ماردی اس عورت نے جو یہ منظر دیکھا شرم سے پانی پانی ہوگئی اس نے شوہر سے کہا شوہر نے اپنی فریاد شیر شاہ کے دربار میں پیش کیا شیر شاہ فوراً فریاد کو سنا اور ایک وفد کو اس بات کی تحقیق کے لئے بھیجا۔ بات صحیح تھی۔ شیر شاہ نے فرمان جاری کیا کہ جس جگہ بنیا کی بہو ادھ ننگے ہو کر غسل کر رہی تھی اسی طرح شہزادے کی بیگم ادھ ننگے ہو کر اسی جگہ غسل کرے اور اس ہاتھی پر اسی طرح بنیا پان کی گلوری منہ میں ڈال کر سوار ہو کر جائے اور اس کے ننگے جسم پر پان کی پیک مارے یہ فیصلہ سن کر شہزادے نے معافی مانگی اور بہن بنایا۔ یہ سارے واقعات حالات قومی یکجہتی کے اسباق اکثریتی طبقے کے بچوں کو نہیں بتایا جائے گا۔ اس ذہنیت کو بدلا نہیں جاسکتا فرقہ پرستی کی بیج ایک منظم طریقے سے شاخائیں لگا کر طرح طرح کے ویڈیو دکھلا کر اقلیت کے لوگوں کو برا اور دشمن بنا کر ذہنوں میں بیٹھایا جاتا ہے۔ درس کی کتابیں ایسی مرتب کی جاتی ہیں جس میں ایک خاص فرقے کو ہر طرح کا مجرم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ کئی کئی جگہوں پر شپتھ۔ اور سنکلپ لیا جاتا ہے کہ کٹوؤں سے بدلہ لینا ہے۔ مسلم حکمرانوں کے دور کے فرضی اور غلط قصے بتا کر ذہنوں میں زہر گھولا جاتا ہے۔ ویسے مہیش بھٹ جو فلم بنا رہے ہیں اس میں مسلم لڑکی کی اداکاری اور کردار پروا ویلا مچانا ایک حماقت ہے مذہب اسلام میں ناچنا گانا فلم سنیما تھیٹر غیر اسلامی اور غیر شرعی ہیں گانا تھرکنا حرام ہے۔ ویسے مہیش بھٹ صاحب کی والدہ شیریں صاحبہ ایک خوبصورت دوشیزہ تھیں۔ انہیں مسٹر بھٹ کے آغوش میں ہی سکون ملا ان دونوں کے اس سکون کے ردعمل میں مہیش بھٹ کا جنم ہوا۔ سنجے خاں کی صاجزادی مشہور فلم اسٹار ریتیک روشن کی اہلیہ بنیں۔ اداکار سلمان خان کی بہن الورا اغل اگنی ہوتری کی بیوی بنیں۔ دلیپ کمار کی اہلیہ سائرہ بانو کی بھتیجی نے اداکار سمیت سہگل سے شادی کیا فلم اسٹار جبیں مسٹر آشوک کاک سے بیاہی گئیں نرگس صاحبہ نے سنیل دت سے شادی رچائی۔ شیخ عبداللہ کی پوتی فاروق عبداللہ کی صاجزادی سارہ عبداللہ نے راجیش پائلٹ کے صاجزادے سے شادی رچائی۔ مال حرام بود سوئے حرام رفت۔ اس سے اسلام کی پاکیزگی اور تابندگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ایشور یہ رائے سلمان خاں سے اور مشہور قومی آرٹسٹ مقبول فدا حسین مادھوری دکشت پر فدا ہوگئے۔ فوراً ماتوشری سے شری بالا صاحب ٹھاکرے کا فرمان جاری ہوا۔ کہ ہے وقت ابھی توبہ کرلو واللہ مصیبت ہو جائے ان لوگوں نے جان کی خیر اسی میں مانی کہ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا۔ ورما صاحب ویسے ہماری طرف بھوجپوری میں ایک مشہور کہاوت ہے کہ سیٹھ ساگ توری کے۔ سیٹھ راگ ہوری کے۔ سیٹھ نار چوری کے۔ یہ مثل تو پہلے سے مشہور ہے۔ کھلی ہوئی ٹانگوں سے یا چھپے ہوئے لباس سے کوئی فائدہ نہیں ہے اس راہ کا جو راہی ہوگا وہ اپنی منزل تلاش کر ہی لے گا مگر ہوتا یہ ہے کہ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔

حقانی القاسمی، نئی دہلی

''بہاری، باہری اور تمثیلِ نو''

تازہ ''تمثیل نو'' میں 'کچے کیلے کے کوفتے، جیسا ذائقہ محسوس ہوا' بالکل نیا اور مختلف۔ سنا ہے کہ کچے...... کوفتے کھانے سے تخلیقی تحرک اور تنقیدی تموج میں ''غیر معمولی'' اضافہ ہوتا ہے اور عرفان و آگہی کی نئی منزلیں روشن ہوتی ہیں۔ کبھی آپ بھی یہ تجربہ کر کے دیکھئے کہ ان دنوں آپ رسالے میں نت نئے تجربے کر رہے ہیں۔ یہ کم اذیت ناک تجربہ ہے کہ ایک ایسی ریاست سے رسالہ نکال رہے ہیں جہاں صحت مند سیاست بھی Survive نہیں کر پاتی اور جو خلائی سائنسی ادارہ ناسا کی رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ کثافت زدہ ریاست ہے اور اس کا اثر وہاں کی تخلیقی، ادبی صورت حال پر بھی نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کے بعد بہار سے باہر والوں سے کہیں زیادہ اندر والوں کو اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ سچائی کیا ہے، مجھے پتہ نہیں، ممکن ہے بہار میں اتنا اندھیرا نہ ہو، مگر اجالا بھی زیادہ نہیں ہے، اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے المیہ یہ ہے کہ خود اہل بہار، بہار کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ مظہر امام، حسین الحق، وہاب اشرفی، مناظر عاشق ہرگانوی، جابر حسین اور شکیل الرحمٰن کو مضحکہ بنانے والوں اور مخالفت کرنے والوں کا تعلق آخر اُردو کی کس بستی سے ہے؟ ذرا سوچئے، صورت حال خود بخود واضح ہو جائے گی۔ میں علی گڑھ کے ان جملوں کو نہیں دہرانا چاہتا جو میرے احباب اکثر کہا کرتے تھے۔ مجھے علم ہے کہ اُردو زبان کی زمین پر بلائیں تو ہر طرف سے اترتی رہی ہیں۔ ویسے وے لوگ، غلط نہیں تھے جو بہار کی بابت بولتے رہتے تھے۔

آپ آندھی میں چراغ جلا رہے ہیں۔ یہی اصل جہاد ہے، اسے جاری رکھئے اور 'تمثیل نو' کو 'تخریب' سے بچائے رکھئے، یہی آپ کی اصل کامرانی ہے۔

شمارہ ۱۷، ۱۸ کے سرورق پر صنادید ثلاثہ کی تصویر اور اندرون کی فکری تنویر سے رسالے کی روح کو نئی سرشاری اور اوج کو نئی موج مل گئی ہے۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آزاد غزل کی تفہیم اور تقسیم میں منصور عمر، ابوذر ہاشمی، جمال اُویسی، مناظر عاشق ہرگانوی کے مضامین معاون اور مفید ثابت ہوں گے۔ ان تمام تحریروں میں تمکنت ہے۔

سید منظر امام کے ''مے موارُ'' سے محظوظ ہو رہا ہوں۔ نہایت شگفتہ نثر میں 'یادِ ایام' لکھ رہے ہیں۔ وداع و وصل کی کہانیاں بھی خوب ہیں، نرگس جہاں اور جاوید اختر چودھری کے افسانے نئے افق کی تلاش میں ہیں۔ نظمیں نازک اندام، کجرارے اور غزلیں غزال ہیں۔ حامدی کاشمیری، منظر شہاب،

امین اشرف، رفیق شاہین، راشد جمال فاروقی، رئیس الدین رئیس، اقبال آرش اور شمس جلیلی کی شمولیت نے اس 'چمنستان سخن' کو رنگارنگ بنادیا ہے۔ ان شاعروں کے اسٹائل اور مسلک سے ہر حساس فرد متاثر ہوگا۔ غزلیں واقعتاً Spellbinding ہیں۔

تبصرے وقیع اور آپ کے جائزے وجیہ ہیں۔ خطوط میں تو معلومات کا سمندر ہے۔ طلحہ رضوی برق صاحب نے ''عروضی اغلاط'' کی خوب نشاں دہی کی ہے۔ شاعروں کی شامت اعمال، برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر، ویسے نثر میں بھی ''عروضی خامیاں'' تلاش کی جائیں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ اُردو میں زبان و بیان کی اتنی خامیاں ہیں کہ اُردو کی الفت میں اس کلفت سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اساتذہ ادبیات اردو کے حال پر اللہ رحم فرمائے کہ یہ بے چارے مرفوع القلم ہیں۔ طلحہ رضوی برق صاحب جانے کس زبان کے پروفیسر ہیں۔ تحریر کی تمازت اتنا تو پتہ دے رہی ہے کہ موصوف اُردو کے پروفیسر نہیں ہیں۔

''تمثیل نو'' کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خدا آپ کے جنوں کا سلسلہ دراز کرے کہ ادب میں دیوانگی ہی کام آتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی یہی دعا کی تھی کہ 'مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر' اور جنون سے ہی شعور کے سارے مرحلے طے ہوتے ہیں۔ میر تقی میر کا معنی سے معمور ایک عمدہ شعر ہے:

خوش ہیں دیوانگی میر سے سب　　　　کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

سید مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ''خوش فہمی'' میں بھی ایسی ہی دیوانگی ہے، اس کا ذکر پھر کبھی!

پروفیسر ایم۔ صدرالدین، (شعبۂ اُردو، کارمائکل کالج، ڈھاکہ، بنگلہ دیش) مقیم: کراچی (پاکستان)

نقوشِ علی نگر: میری نظر میں

عزیزی ڈاکٹر امام اعظم (مدیر تمثیل نو، دربھنگا) کی وساطت سے مجھے عزیز القدر برادرم غلام فرید سلمۂ کی کتاب ''نقوشِ علی نگر'' ملی۔ موصوف نے اس کتاب پر اپنے تاثرات لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ ان کا بار بار تقاضا رہا کہ میں علی نگر کے نقوش اور وہاں کے علمی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی ورثے پر خامہ فرسائی کروں۔ وہاں کے پوست کندہ حالات و واقعات لکھوں۔ ہجرت کو تقریباً بیالیس سال ہو گئے۔ کٹی پتنگ کی طرح میرا واسطہ اب وہاں سے نہیں رہا گرچہ میرے قیمتی ماہ و سال علی نگر کی مٹی میں ہی گزرے ہیں اور وطن عزیز کی یادیں اتنی گہری ہیں جنہیں کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ بقول شاعر:

خاکِ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر　　خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

یوسفؑ کہ بمصر پادشاہی میکرد　　می گفت گدا بودنِ کنعاں خوشتر

ہجرت کی تلخیاں باوجود تمام تر سہولیات کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی ہیں اور آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ہیں۔ اس کا مداوا اب مشکل ہی نہیں محال ہے مگر ؎ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ ؛ ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ۔
کے مصداق میں نے رابطہ استوار رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔ بنگلہ دیش کے قیام کے دوران کئی بار بھارت کا جاں گسل سفر کر کے اپنوں سے بالخصوص محترمہ ہمشیرہ صاحبہ سے جو اماں مرحومہ کی دائمی جدائی کے غم غلط کرتی رہیں اور جن کی شفقت و محبت میری زندگی کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت تادیر قائم رکھیں۔ اب بفضل خدا میں تہتر (۷۳) کے پیٹے میں ہوں۔ اب زیادہ پڑھنا لکھنا مشکل ہے۔ مجھے بیکراں خوشی ہے کہ جواں سال عزیزی غلام فرید سلمۂ نے یہ کام بڑی عرق ریزی سے سرانجام دیا اور علی نگر کے نقوش کو تحریری دستاویز کی صورت میں دوام بخشا۔

میں نے ''نقوشِ علی نگر'' کو بار بار پڑھا اور بہت متاثر ہوا۔ غالبؔ نے ہمارے تاثرات کی ترجمانی کیا خوب کی ہے۔

فرصت ملے تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم　　تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے

عزیزم غلام فرید نے ان گنج ہائے گراں مایہ کی خدمات، ان کی شخصیات اور خدمتِ خلق کے روشن کارناموں کی خوب عکاسی کی ہے۔ یہ مشکل کام انہوں نے اپنی یادداشت، رفتگاں کے مسودے اور قائماں کی زبانی کیا ہے۔ یہ ان کے ذوق، لگن، کاوش اور خلوص کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ علی نگر کے بیشتر اہل قلم اور فنکاروں کے کمالات کا ایسا جامع تذکرہ پیش کیا ہے۔ جسے پڑھ کر محبت برہم کی جھلکیاں نظروں کے سامنے آموجود ہوتی ہیں۔ بہت سی بھولی بسری یادیں تازہ ہو کر کبھی غم اور کبھی خوشی سے ہمکنار کرتی ہیں۔ جزئیات کے بیان کرنے میں بھی موصوف کو دسترس حاصل ہے۔ واقعہ نگاری، بزرگوں کی سیرت نگاری اور ان کے کمالات کا اظہار و بیان ایسے پرکشش انداز میں کیا ہے کہ ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔ تحریر میں اصلاحی اور معلوماتی پہلو ہر جگہ نمایاں ہے۔ رواں نثر کا یہ مرقع قابل داد ہے۔ مصنف موصوف نے بزرگوں کے منثورات اور منظومات کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان کی ادبی اہمیت سے کوئی ادیب معترض نہیں ہوسکتا۔ فردوسی نے فارسی میں شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کیا تھا۔ ؏ عجم زندہ کردم بہ ایں فارسی۔ غلام فرید نے اپنی مادری زبان اردو کو زندہ کیا ہے۔ علی نگر کے خد و خال، ماہ و سال، رفتگاں و قائماں کے کارناموں کو صداقت و امانت کے ساتھ محفوظ کر دیا ہے جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ رہیں گی۔ علامہ اقبال کا یہ مصرعہ بے ساختہ یاد آگیا۔ ''ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے۔''

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اللہ تعالیٰ غلام فرید کو درازیٔ حیات اور بے پایاں سعادتوں سے نوازتا رہے اور دینی و دنیاوی علوم کی ترویج و اشاعت کا بھرپور حوصلہ دے۔

نظر اپنی اپنی

(تبصرے کے لئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے)

نام کتاب: حرف تازہ بیاد نظیر صدیقی، مرتبین: فرحت پروین ملک- احمد زین الدین، صفحات: ۴۷۲، قیمت: ۲۵۰
ناشر: زین پبلی کیشنز، اے۔۸، ندیم کارنر، بلاک N، ناظم آباد، کراچی، ۷۴۶۰۰ (پاکستان)
مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور۔

پروفیسر نظیر صدیقی نقاد، ادیب، شاعر، انشائیہ نگار، خاکہ نگار اور دانشور تھے۔ اُردو اور انگریزی ادب میں یکساں دسترس رکھتے تھے اور دونوں زبان میں ساری زندگی لکھتے رہے۔ ہر دو زبان میں تقریباً تیس کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد اردو اور انگریزی میں جتنے مضامین لکھے گئے بعض پرانے مضامین کے ساتھ ان کی اہلیہ فرحت پروین ملک اور سہ ماہی ''روشنائی'' کراچی کے ایڈیٹر احمد زین الدین نے بیحد خلوص سے ترتیب دیا ہے۔ ان مضامین میں عقیدت اور محبت ہے۔ مضمون نگاروں میں ابوالخیر کشفی، عندلیب شادانی، وقار عظیم، حنیف فوق، سید معین الرحمن، امجد علی شاکر، فصیح احمد صدیقی، ممتاز مفتی، اکبر حمیدی، علی حیدر ملک، انیس نصرت زیدی، احسان اکبر، حسین احمد، جمیل عظیم آبادی، افتخار اجمل شاہین، ناصر عباس نیر، نورینہ تحریم بابر، فرحت پروین ملک نے تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ سلیم احمد، مبارک مونگیری اور یاور امان نے منظوم خاکے لکھے ہیں۔ نظیر صدیقی کی کتابوں ''شہرت کی خاطر''، ''تاثرات و تعصبات''، ''اقبال اینڈ رادھا کرشنن''، ''حسرت اظہار''، ''گزرگاہ خیال''، ''غالب اور اقبال'' اور ''نامے جو مرے نام آئے'' پر بالترتیب عندلیب شادانی، آل احمد سرور، مظفر علی سید، ناصر عباس نیر، محمد رضا کاظمی، حسین احمد، احمد زین الدین، افتخار اجمل شاہین اور معین الدین احمد کے مضامین شامل ہیں۔ صفحہ ۲۲۵ سے ۳۲۵ تک نظیر صدیقی کے اور ان کے نام منتخب خطوط اور نظیر صدیقی کا الطاف گوہر پر آخری مضمون اور ان کے پسندیدہ شاعر صادق القادری پر بھی مضمون کتاب کے معیار میں اضافہ کرتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انتقال کے بعد مشاہیر کے جو تاثرات منظوم اور منثور سامنے آئے جو بھی شامل کتاب ہیں۔ ان میں جمیل جالبی کے ساتھ احمد زین الدین اور فرحت پروین ملک کے تاثرات بھی ہیں۔ انگریزی حصے میں یونس احمر، محمود الرحمن، محمد رضا کاظمی، سید عرفان رضا، سیما فرحت کے مضامین اور بعض اخبارات کے تراشے شامل ہیں۔ نظیر صدیقی نومبر ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور ان کا انتقال اپریل ۲۰۰۱ء میں ہوا۔ وہ ممتاز، سربرآوردہ اور عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ کئی دانش گاہوں کے وہ استاد بھی رہے۔ اسی لئے ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ سریع الاحسان نظیر صدیقی اپنی متنوع تحریر کی بدولت ایک شناخت بن چکے تھے۔ ان پر یہ کتاب انہیں مکمل طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے خوبصورت چھپی ہے۔

نام کتاب: سرگوشی بہاروں کی، شاعرہ: صدف جعفری، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۶۰ روپے
ناشر: مکتبہ تعلیمات، ۲۶ زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳۰۰۰، مبصر: ڈاکٹر عبید الرحمن، نئی دہلی

زیر نظر تصنیف محترمہ صدف جعفری کی نظموں، غزلوں اور ان کے ماہیے اور ہائیکو کا مجموعہ ہے۔ حمد و نعت اور دعا میں بھی کتاب کے شروع میں شامل ہیں۔ غالب حصہ غزلوں کا ہے۔

صدف جعفری رسالوں میں تواتر سے شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں ہند و پاک کے کئی معتبر رسائل شامل ہیں۔

یہ شاعرہ کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو بقول ان کے ان کی تیرہ چودہ برسوں کی کاوشوں اور ریاضتوں کا نتیجہ ہے۔ بڑی اچھی بات یہ ہے کہ اس نقشِ اوّل میں انہوں نے کسی ناقد کا سہارا نہیں لیا ہے جو آج ایک عام چلن ہے۔ نقشِ اوّل ہی کیا اکثر و بیشتر تو کئی کتابوں کے خالق بھی اس سہارے کے بغیر سفر طے کرنا گویا گناہ سمجھتے ہیں۔ یہاں اس کی ضرورت یوں بھی نہیں ہے کہ محترمہ صدف جعفری کے نام سے ہم آشنا ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری رسائل کے حوالے سے اُردو دنیا تک پہنچائی ہے اور اپنے لئے ایک مقام متعین کرلیا ہے۔ یہاں ایسی نظمیں شامل ہیں جو شاعرہ کی نجی زندگی، ذاتی تجربات، تاثرات اور خیالات پر مبنی ہیں۔ دعا میں وہ یوں گویا ہیں کہ: کبھی خود میں اگر تجھ کو تلاوت کرنے بیٹھی ہوں/ تو میرے ذہن میں ایک چیخ سی ابھری ہے رہ رہ کر/ کوئی دلکش، حسیں مفہوم تو دے دے/ جہانِ آب و گل کو بھی/ بساطِ آرزو کو بھی/ کہ تو ہے برتر و بالا/ مرے مولا

جہاں ایسی نظمیں موجود ہیں جو ہندوستان، گاندھی جی، کلکتہ سے منسوب ہیں تو وہیں ستی کنواریاں، جھوٹ کا اُجالا، ضد، بگڑ کے دوں، زندگی یہ بھی سچ ہے، سفر بے قرار موسم کا، سوچتی ہوں، موڑ اور مراد ل جیسی نظمیں شاعرہ کے جذبات اور تجربات کی عکاس ہیں۔ یہ نظمیں ہمیں بہت متاثر کرتی ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ شاعر یا شاعرہ جس آب و تاب سے غزلوں میں نمایاں ہو اسی طرح نظموں کے حوالے سے بھی اعتبار حاصل کرلے۔ یہاں یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ محترمہ صدف جعفری کی نظمیں قاری کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ایسی کئی نظموں کے درمیان ایک نظم 'سوچتی ہوں' ہے۔ یہ سطور دیکھیں:

کیا وقت کی ہر سانس سے/ کل بھی اٹھے گا اک دھواں/ نوحہ کناں/ بہتے لہو کے درمیاں؟/ کیا کل بھی ہم/ سنتے رہیں گے/ چشمِ نم سے/ سانس کے ہر زیر و بم سے/ اضطرابوں کی غزل/ تھامے ہوئے زخمی سا پل؟؟/ سوچتی ہوں۔

اس مجموعہ میں مساوی الوزن اور غیر مساوی الوزن ماہیے کے علاوہ ہائیکو بھی شامل ہیں جنہیں شاعرہ کی فنکاری نے آہنگ و غنائیت عطا کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ شاعرہ کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے اور چھوٹے چھوٹے ذاتی تجربات نے بھی کہیں نہ کہیں اپنی جگہ حاصل کرلی ہے۔ یہی بات غزلوں میں بھی نظر آتی ہے کہ ان کی غزلیں زمانہ کی رفتار اور اس کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ یہ جدید لب و لہجہ کی قائل تو ہیں مگر روایتوں سے گریز بھی نہیں۔ یعنی ایک توازن کی کیفیت کم و بیش تمام غزلوں میں نمایاں ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

یہ کیا قصہ سنایا آج تم نے — کہ کوئی سو گیا ہے شام ہی سے

دیکھو موتی بچے ہیں پلکوں پر — دل سے آنکھوں میں آ بسا بادل

دامِ صیاد نظر میں نہیں رکھنا کافی — کچھ نہ کچھ طاقتِ پرواز بھی پر میں رکھنا

سکڑے سمٹے سے رات بیٹھے تھے — سو گئے دن میں دھوپ اوڑھے کئی

امید واثق ہے کہ یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں مقبولیت اور پذیرائی حاصل کرے گا۔

نام کتاب: چڑیا نگری، مصنف: عادل حیات، صفحات: ۴۸، قیمت: ۲۵ روپے، اشاعت: ۲۰۰۳ء
ناشر: حیات پبلی کیشنز، A595 امر پوری، نبی کریم، نئی دہلی مبصر: ڈاکٹر عبید الرحمن، نئی دہلی

اُردو زبان میں ادبِ اطفال پر لکھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ شاید اس کی وجہ اس فن کا مشکل ہونا ہے کہ یہاں بچوں کی نفسیات پر گہری نظر رکھنی پڑتی ہے اور چوں کہ تمام بچوں کی ذہنی سطح یکساں نہیں ہوتی۔ لہٰذا ننھے قاری کی ذہنی سطح پر اتر کر دلچسپ انداز میں کہانیاں، مضامین یا نظمیں لکھنا درحقیقت بڑا مشکل کام ہے۔

عادل حیات نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ غزلوں کے حوالے سے انہوں نے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ وہ بچوں کے لئے بھی لکھتے رہے ہیں جن میں کہانیاں بھی شامل ہیں اور نظمیں بھی۔ اس وقت میرے پیش نظر بچوں کے لئے ان کی کہانیوں کا ایک مختصر انتخاب 'چڑیا نگری' ہے۔ جس میں آٹھ کہانیاں شامل ہیں۔ ان تمام کہانیوں کے ذریعہ عادل حیات نے بچوں کی ذہنی تربیت کی کوشش کی ہے۔ جس کے لئے انہوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں اور نصیحتوں کو وسیلہ بنایا ہے۔ کتاب کا نام کتاب میں شامل پہلی کہانی 'چڑیا نگری' سے مستعار ہے۔ میرے نزدیک یہ پہلی کہانی ہی عادل حیات کے کہانی کار ہونے کی دلیل پیش کرتی ہے۔ اس میں مشاہدہ کی آنچ بھی ہے اور معاشرے کی بھلائی کی تڑپ بھی۔ امجد نام کے ایک شرارتی بچے کی وجہ سے 'چڑیا نگری' کی چڑیائیں تنگ آجاتی ہیں کچھ وہاں سے دوسری جگہوں پہ جا بستی ہیں مگر کچھ ایسی بھی ہیں جو اپنی زمین کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ تمام چڑیاں سارس جسے محبت کے امین پرندہ کے مشورے سے اس مسئلہ کے حل کی طرف رجوع کرتی ہیں اور سب اس فیصلے تک پہنچتی ہیں کہ یہ ان کے افعال کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے ذکر خداوندی سے منھ موڑ لیا ہے۔ لہٰذا امجد کی دہشت کی صورت خدا کی طرف سے عذاب نمودار ہوا ہے۔ سب پرندے ذکر خداوندی میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد جب امجد ان کے پاس انہیں پریشان کرنے آتا ہے تو اس پر ہیبت سی طاری ہوجاتی ہے اور درختوں پر چڑھتے ہوئے اس کے پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔ وہ اسے بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر سہم جاتا ہے اور یوں وہ پرندوں کو پریشان کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کہانی کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کہانی کار نے بچوں کو لڑائی جھگڑا اور ظلم وستم سے دور رہنے کی تلقین کی ہے اور معاشرے میں انتشار پیدا کرنے سے روکا ہے۔ مگر یہاں جو بات کھٹکتی ہے وہ ہے امجد کے ڈر کی وجہ۔ اسے بھوت پریت کے سایہ سے جوڑا گیا ہے نہ کہ خوف خدا سے۔ حالاں کہ مقصد خوف خدا کی تعلیم دینا ہے۔

دوسری کہانی 'اتحاد کی جنت' ایک عام مشاہدہ کی کہانی ہے جسے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا گیا ہے یعنی ایک اکیلا کمزور ہوتا ہے اور بہت سے مل کر مضبوط۔ یہاں یہ بھی بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اکیلا اپنی مکمل شناخت بھی نہیں بنا پاتا مگر جب اسے دوسرے کا اعتبار اور ساتھ حاصل ہوتا ہے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس نکتہ کو سمجھانے کے لئے قلم، کاغذ اور روشنائی کے تمثیلی کردار تخلیق کئے گئے ہیں۔ تیسری کہانی 'پنسل کی چوری' بچوں کو یہ سبق دیتی ہے کہ جلد بازی سے کام لینا عقلمندی نہیں ہے کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں شرمندگی اور پچھتاوے کا سامنا کرنا پڑے۔ اسی طرح کہانی 'تبدیلی' درحقیقت جیسی کرنی ویسی بھرنی کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ امجد کی بدمزاجی اور اس کے دوست ثاقب کی خوش مزاجی اور مروت کے حوالے سے کہانی بُنی گئی ہے۔ جس کا مقصد بچوں کو خوش اخلاق بنانا ہے اور دوسروں کے تئیں خلوص ومحبت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اسی قبیل کی کہانی 'گڈو کی واپسی' ہے۔ جس میں گڈو جیسے شرارتی بچے کی اصلاح کے لئے دردمندی اور محبت کے جذبے کو استعمال کیا گیا ہے کہ یہی وہ خوبیاں ہیں جن سے برے سے برا آدمی بھی اچھا بن جائے اور غیر سے غیر بھی اپنا۔ آخری کہانی 'محنت کا پھل' ہے۔ یہاں بھی گڈو جیسے کاہل لڑکے کی اصلاح محنت کی اہمیت اُجاگر کر کے کی گئی ہے۔ ہاں یہ اہمیت پوری طرح کھل کر بیان نہ ہو پائی کہ اس نکتہ تک گڈو کی رسائی کے لئے جس دوسری کہانی کا استعمال کیا گیا ہے وہ مبہم سی ہے۔ کتاب کی تمام کہانیاں سبق آموز ہیں۔ زبان سادہ ضرور ہے مگر کہیں کہیں مشکل الفاظ بھی ہیں ویسے الفاظ کے معنی کتاب کے آخر میں دے دیئے جاتے تو بہتر ہوتا۔

میرے نزدیک ادب اطفال کے حوالے سے ایک خواہش یہ ہے کہ ہم اپنی زبان میں ادب اطفال میں ایک مثالی بچہ یعنی Ideal boy پیش کریں۔ ایک ایسا کردار جس سے تمام بچے مانوس ہوں اور اسے اپنی زندگی میں مثال کی

صورت اپنائیں۔ جس طرح چاچا چودھری، سابو، اسپائڈر مین، نئتم یا شکتی مان کو بچے آئیڈیل تصور کرنے لگے ہیں اور ان سے بے پناہ محبت کرتے ہیں کیا ہی اچھا ہو اگر بچوں کی کردار سازی کیلئے ایک بچے کو ہی ایک نشان یا Symbol کی طرح استعمال کیا جائے۔ شاید عادل حیات صاحب اس جانب توجہ دیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ کتاب بچوں کو ضرور پسند آئیگی۔

نام کتاب: اردو شاعری کا احتجاجی شعور، مصنف: ڈاکٹر محمد مظاہر الحق، صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، مطبوعہ: ۲۰۰۴ء،
رابطہ: نعمت اللہ ایجوکیشنل سوسائٹی، شاہین منزل، نوگھرا، سلطان گنج، پٹنہ مبصر: ڈاکٹر صلاح الدین رام نگری۔

اُردو شاعری کے مزاج و اسلوب پر جو اعتراض کئے جاتے رہے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اس کی فضا غیر ملکی رہی ہے۔ حتیٰ کہ 'اردو شاعر پر ایک نظر' حصہ اوّل کے مقدمہ میں فضل الرحمن نے یہ بھی کہہ دیا کہ "اردو شعراء نے فارسی شاعری کو ہو بہو اپنی زبان میں منتقل کرلیا۔ ان کا فن مترجم کا ہے، شاعر کا نہیں" یہ ایک بنیادی نوعیت کا اعتراض ہے جسے مسترد کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد مظاہر الحق کہتے ہیں کہ "یہ اعتراض اردو شاعری کے مزاج و اسلوب سے ناواقفیت کی دلیل ہے کیوں کہ مستعار شاعرانہ خیالات و تصورات، اعلیٰ درجے کی شاعری تو بڑی چیز ہے، معیاری شاعری کے نمونے بھی پیش نہیں کر سکتے، مقلدانہ رجحان کے ذریعہ حسن کاری کے تقاضوں کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے۔ شاعری میں زندگی کا تجرباتی برتاؤ موجود نہ ہو تو شاعری بے جان اور لفظی بازیگری بن جاتی ہے۔" ظاہر ہے معاشرتی زندگی کے محرکات و عوامل سے متاثر نہ ہونا، انسانی زندگی کی تلخیوں، سختیوں اور ابتلاؤں پر کسی ردعمل کی کیفیت سے بالکل عاری رہنا، شاعر و فنکار کیا؟ عام انسانی مزاج کے بھی خاصہ کے خلاف ہے تو بھلا، کسی بے حس کی شاعری کیا ہوئی؟ اور ایسے فن کے مطالعے کا کیا جواز.....؟

اسی ضمن میں ڈاکٹر مظاہر الحق نے اردو شاعری کا صرف ایک رُخ پیش کیا ہے اور وہ ہے "اُردو شاعری کا احتجاجی شعور" اس ذیل میں پوری اردو شاعری کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرنے کے لئے اس تصنیف کو موصوف نے چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلا باب 'احتجاجی شعور کا مفہوم' ہے۔ جس میں احتجاج کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے اور احتجاج کے مختلف رنگ و آہنگ سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب دو عنوانات پر مشتمل ہے۔ پہلا عنوان "حقائق حیات سے شعر و شاعری کا تعلق" ہے دوسرا عنوان "سماجی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی مسائل حیات سے متعلق شاعرانہ ردعمل" ہے۔ اس کے تحت دو ضمنی عنوانات قائم کئے گئے ہیں پہلا 'شاعرانہ ردعمل کے اسالیب' دوسرا "اُردو شاعری میں ردعمل کے اسالیب کا اظہار" تیسرے باب کا مرکزی عنوان ہے 'اردو شاعر میں احتجاجی شعور کے انعکاس کا مطالعہ' جس میں تین ضمنی عنوانات پہلا 'کلاسیکی شاعری کا احتجاجی شعور' دوسرا "ترقی پسند تحریک سے آزادی تک کی شاعری کا احتجاجی عنصر" تیسرا "آزادی کے بعد ۱۹۸۰ء تک کی شاعری کا احتجاجی میلان" کے تحت اردو شاعری کے سرمائے کا تجزیاتی مطالعہ کرکے احتجاجی شعور کے اظہار اور اس کے اسالیب کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ چوتھا باب "شاعری میں سماجی تغیرات اور احتجاجی میلانات کے ربط کا تجزیہ" اور "احتجاجی شاعری میں ارضی زندگی کے واقعات سے متعلق ردعمل کا فطری انداز" ہے۔

اس طرح مصنف نے اردو شاعری کے احتجاجی شعور کا جائزہ مختلف زاویئے سے لیا ہے۔ اردو شعراء کے شعور و احساس پر بڑے جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا فن مترجم کا نہیں، شاعر کا ہے۔ اعلیٰ شاعری کی طرح اردو شاعری کی بھی جڑیں، حیات انسانی کی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ یہ بھی اپنی ارضی صداقتوں سے لبریز اور اپنی فضاؤں کی عکس ریز ہے۔ کاش! موصوف اگر تازہ کار شعری تخلیقات پر بھی نظر ڈالنے کی زحمت کر لیتے تو اپنی بات اور بھی

مضبوط و مدلل طور پر پیش کرنے کا کمال حاصل کر لیتے۔ تاہم یہ تصنیف ڈاکٹر مظاہر الحق کے عمیق مطالعہ کی مظہر ہے۔

نام کتاب: خطوط بنام محبوب علی خاں اخگر، مرتب: ڈاکٹر فاروق شکیل، صفحات: ۱۶۴، قیمت: ۲۰۰ روپے
مطبوعہ: ۲۰۰۳ء، رابطہ: EWS-375، سنتوش نگر، حیدر آباد۔ مبصر: ڈاکٹر صلاح الدین رام نگری۔

خطوط و مراسلے نجی گفتگو کے تحریری روپ ہوتے ہیں اور نجی گفتگو میں انسان زبان و بیان کے کسی ضابطے کی رعایت نہیں کرتا بلکہ بلا تکلف اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس لئے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ یہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے نہ صرف عالمانہ و فنکارانہ حیثیت کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ بیرون کے علاوہ اندرون کو بھی منعکس کر دیتے ہیں بنا بریں ہر دور اور ہر زبان میں مشاہیر کے خطوط منظر عام پر آتے رہے ہیں اور اپنی اہمیت و افادیت منواتے رہے ہیں۔

زیر نظر مجموعۂ خطوط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ سیپ میں موتی کی طرح سمندر کی تہہ میں پوشیدہ استاد الشعراء، محمد بہاء الدین بہبود علی صفی اورنگ آبادی کو دنیائے ادب کے سامنے پیش کرنے والے شاعر و محقق محبوب علی خاں اخگر کے نام ۱۹۰ خطوط کا یہ مجموعہ ہے۔ عموماً سبکدوشیٔ ملازمت کے بعد قویٰ اتنے مضمحل ہو جاتے ہیں کہ بقیہ زندگی لوگ دن گنتے میں گذار دیتے ہیں مگر اخگر صاحب نے ۱۹۸۳ء میں ڈپٹی کلکٹر سے ریٹائر ہونے کے بعد بحر تحقیق و تدوین میں غواصی شروع کر دیا جو پتہ پانی کرنے کا کام ہوا کرتا ہے اور پھر لولو و مرجان دنیائے ادب کو پیش کرتے رہے۔ اسی سلسلے میں مشاہیر و ہمعصر علماء و ادباء سے جو مراسلت ہوئی اسی کی ایک جھلک ڈاکٹر فاروق شکیل نے ہمیں دکھائی ہے۔

اس مجموعہ میں ملک کے علاوہ بیرونِ ملک پاکستان، انگلستان، امریکہ اور کینیڈا وغیرہ کے علماء و ادباء کے ایسے خطوط ہیں جن سے قدر دانیٔ اخگر، عمیق مراسم اخگر کے علاوہ علمی و لسانی مبحث، ادبی سرگرمیوں کے کوائف، ادباء و شعراء کے رویے سے آگاہی ہوتی ہے۔ ایسے مجموعے دلچسپ ہوا کرتے ہیں سو یہ بھی قاری کو کچھ دیر کے لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے مگر ضخامت کے اعتبار سے اس کی قیمت اتنی ہے کہ حبِ محبوب علی ہی جوش میں آسکتا ہے ورنہ ہماشما کا جیب اس سے لطف اندوز ہونے کی اجازت شاید ہی دے سکے گا۔

نام کتاب: شاعری کا سفر (شعری مجموعہ)، شاعر: افتخار اجمل شاہین، صفحات: ۲۴۸، قیمت: ۲۰۰ روپے
مطبوعہ: ۲۰۰۵ء، زیر اہتمام: بزم شادانی فلیٹ G-9 صائمہ کلاسک، گلشن اقبال، بلاک A-10، کراچی
مبصر: ڈاکٹر صلاح الدین رام نگری۔

افتخار اجمل شاہین نے زمانۂ طالب علمی میں شیخ پورہ، بہار سے شاعری کا سفر شروع کیا مگر عظیم آباد پہنچ کر قلم نثر نگاری کی طرف مائل ہو گیا۔ درس و تدریس سے چاٹگام میں جڑے تو وہاں کے مشاعروں کی بہار میں شاعری کا سفر تیز گام ہوا اور سقوط ڈھاکہ کے بعد کراچی پہنچے تو آگہی کا سفر تمام کیا۔ لہٰذا بقول پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق ''انہیں پہلی بٹی کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہوئی'' بلکہ فنکارانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا نام ''انٹرنیشنل ڈائرکٹری آف ڈسٹنگویشڈ لیڈرشپ'' میں از خود شامل کر لیا گیا۔ انجام کار پہلا شعری مجموعہ ''عقیدت کا سفر'' گذشتہ سال منظر عام پر آچکا ہے اور دوسرا مجموعہ غزل زیر نظر ہے جس کی بابت وہ کہتے ہیں ؎

تصویر تو کرتی نہیں طینت کی وضاحت | شاہین ہے کیسا، اسے تحریر میں دیکھو

یہ مجموعہ ایک سو پانچ غزلوں پر مشتمل ہے جن میں ہجرت در ہجرت کے مشاہدے اور تجربے، خوں آشام حالات کے ضرب و کرب، بنتے بگڑتے تہذیبی و اخلاقی اقدار کے درد کی ٹیس، سادہ و موثر اسلوب میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں، مثلاً

جو چاہے لوٹ لے، خوف زیاں نہیں اب تو — لئے میں پھرتا ہوں اپنا مکاں ہتھیلی پر

یا یہ کہ

اگلی ساری صورتیں گم ہوگئیں — شکل دیکھی ایسی دیواروں کے بیچ

ان غزلوں میں غزلیہ روایت کا تتبع بھی خوب ہے۔ جیسے ''صورت بہ بیں حالت مپرس'' کا adoption دیکھئے

اشک ابھی سے کیوں تری آنکھوں میں تیرنے لگے — ہم نے تو داستانِ دل کچھ بھی ابھی کہا نہیں

یہ اس مجموعہ کی پہلی غزل کا شعر ہے جس کا مطلع ہے

رفعتِ زندگی نہیں، عظمتِ آدمی نہیں — ایسے جہاں میں زندگی جبر، ہے زندگی نہیں

اسے اس مجموعہ کی تمہیدی غزل سمجھتا ہوں۔ چند مثالوں میں آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ شاہین کے لب و لہجہ میں نرمی ہے، حلاوت ہے، دھیمی دھیمی آنچ ہے اور آگے دیکھیں گے تو کہیں کہیں طنز کی لہر بھی ملے گی۔ انہوں نے روزمرہ کے مشاہدات و تجربات کو روزمرہ میں برتنے کا کمال بھی دکھایا ہے۔ مجھے تو سادگی اور نرم روی ان کے مزاج کا خاصہ معلوم ہوتا ہے جو ان کی شاعری پر حاوی ہے وہ خود بھی کہتے ہیں

آیا نہ شعر میں ترے شاہین شوخ رنگ — کیا کیا نہ رنگ شاعری میں گھولتے رہے

کیا کیا رنگ انہوں نے شاعری میں گھولا ہے یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

البتہ یہ ضرور ہے بقول انور سدید کہ ''ان کی شاعری کا رُخ ذات سے معاشرے کی طرف ہے مجھے ان کی شاعری پر مولانا الطاف حسین حالی کا سایہ پرافشاں نظر آتا ہے'' مگر یہ جو انور سدید نے کہا ہے کہ ''شاہین نے شعر کہتے وقت سادگی کے غیر مروج پیمانوں سے فسوں کاری پیدا کی لیکن اس عمل کے دوران اپنے بوقلموں اور متنوع جمالیاتی زاویوں کو بھی آشکار کر دیا۔ ان کی شاعری کا سفر دراصل ان کی زندگی کے تجربات، احساسات اور ادراکات کا سفر ہے (جو جاری ہے) جس کے پورے مطالعے کے لئے میں آپ کو یہ کتاب پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔'' تو یہ قابل توجہ ہے میری طرح ہر اہل ذوق کو ان کی دعوت قبول کرنے کی سنت ادا کرنی چاہئے۔ الحمدللہ! صوری و معنوی اعتبار سے کتاب مہنگی بھی نہیں ہے۔

نام کتاب: لفظوں میں احساس (مجموعہ غزل)، شاعر: افتخار راغب، صفحات: ۱۶۸، قیمت: ۷۰ روپے
مطبوعہ: ۲۰۰۴ء، ناشر: ادارۂ ادب اسلامی ہند، دہلی، مبصر: ڈاکٹر صلاح الدین رام نگری۔

شاعری میں ہجر و فراق کی کیفیات کے اظہار کی روایت تو قدیم ہے لیکن گلوبلائزیشن اور انٹیلکچوئلزم کے دور میں بہت سی قدیم روایات، اشیاء و نقوش کی طرح مردود و معدوم نہیں ہوئی ہے کہ اس کا تعلق انسانی جبلت سے ہے۔ البتہ ان کیفیات کے رنگ متغیر ہوگئے ہیں بلکہ سائنسی نقطۂ نظر سے یوں کہئے کہ ان کیفیات کے تصورات میں توسیع ہوگئی ہے کہ اب غم روزگار لوگوں کو جغرافیائی حدود پھلانگ کر دنیا کے کسی بھی حصہ میں پہنچا دیتا ہے اور بے وطنی کا یہ عمل جوق در جوق جاری ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

دوست، احباب، وطن، اپنوں سے — کتنے حالات کے مارے ہیں جدا (راغب)

اوراس جدائی نے کیا کیا؟ بقول راغب ؎

زیست کا دل ہی اثاثہ تھا جسے کرکے اس نے پارہ پارہ رکھ دیا

کہ پردیش میں احساس غربت واجنبیت کا بھی حملہ دل پر شدید ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا اظہار تو ہر سطح پر ہونا ہے، لہٰذا شاعری کیا بلکہ ادب میں ہجری ادب کی ایک شاخ قائم ہوتی نظر آرہی ہے سو اس ہجری ادب میں افتخار راغب کا زیر نظر غزل کا مجموعہ ایک اضافہ ہے اور یہ معرضِ وجود میں آیا کیسے؟ انہیں سے سنئے ؎

تمہاری یاد میں اشعار گنگناتے گئے سو اہل درد میں ہوتی گئی پذیرائی

افتخار راغب نے ۱۹۹۸ء میں B.Tech civil سے فراغت پائی اور ۱۹۹۹ء میں گوپال گنج، بہار سے دوحہ، قطر پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے انہوں نے بھی طبع موزوں اور حساس دل پایا ہے سو یہ بھی لفظوں میں احساس سمونے لگے۔ وہ کس طرح ....؟

جس درجہ ہجر رُت میں آنکھیں برس رہی ہیں غزلیں بھی اگ رہی ہیں برسات کے مطابق

اس طرح راغب نے نہ صرف ہجر کے درد اور فرقت کے کرب کا اظہار پہلو بدل بدل کر کیا ہے بلکہ احساس کے ہر پرتو کو شعری پیکر میں ڈھال دیا ہے جس میں جمالیاتی کیف ہے، مضمون آفرینی ہے اور برجستہ وفطری پیرائے بیان اور رواں دواں انداز میں ردیفوں کا استعمال، ان کی فنی سلیقگی کے مظہر ہیں۔ ابھی انہوں نے زندگی کی بتیس منزلیں ہی طے کی ہیں مگر احساس میں وزا کی، طبیعت میں روانی، خیالات میں پاکیزگی ایسی نظر آتی ہے کہ جگہ جگہ شعر دیکھ کر جی پھڑک اٹھتا ہے۔ یہ غزلیں ایک نوجوان شاعر کے روشن مستقبل کی غمازی کرتی ہیں اگر یہ اساتذہ کے کلام سے استفادہ اور ریاضت سے شغف رکھیں تو اشعار دوآتشہ ہوسکتے ہیں اور یہ شاعری میں انفرادیت قائم کرسکتے ہیں۔ یہ مجموعہ صوری اعتبار سے اور قیمتاً بھی قابل قبول ہے۔

نام کتاب: ہم اردو کے ٹیچر ہوئے، مصنف: ڈاکٹر اشرف جہاں، صفحات ۹۶، اشاعت: ۲۰۰۵ء

قیمت: ۵۰ روپے، ناشر: علمی مجلس بہار، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۴، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

اردو کی زبوں حالی کا، حالات کے تجزیہ کا، معاشرہ کی بے توجہی کا اور خود اپنے اندر احساس کمتری کا جو جائزہ ڈاکٹر اشرف جہاں نے پیش کیا ہے وہ صد فیصد سچائی پر مبنی ہے۔ اردو کے لوگ، اردو کے بڑے بڑے دعویٰ کرنے والے، اردو کی روٹی توڑنے والے سب کے سب اس حمام میں ننگے ہیں لیکن اتنی مایوسی کی ضرورت نہیں کیوں کہ زبان کلچر سے جڑی ہوئی چیز ہے اور کلچر میں جب تک توانائی موجود رہتی ہے اس وقت تک کوئی زبان مر نہیں سکتی۔ غیروں کی دشمنی، اپنوں کی بے اعتنائی، خود اپنے اندر اعتماد کی کمی، معاشرہ کی تہذیبی کردار میں تغیر پذیر عناصر کو نئے زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ آج بھی اردو جہاں ہے ہندوستان کی دوسری زبانیں بہت بہتر حالت میں نہیں ہیں۔ آپ کسی گلی کوچے سے گذر جائیے آپ کو اردو کے اشعار، اردو کی غزلیں، اردو کے گیت سماعت میں گونجنے لگیں گے۔ یہ تو اپنے اندر کا احساس ہے کہ اردو مر رہی ہے، اردو کی حالت خستہ ہے ورنہ اردو کا سفر جاری ہے اور اس نے دوسری زبانوں پر بھی اپنی دھاک جمائی ہے۔ ہندوستان کی پارلیامنٹ بھی اردو کے بغیر پر جوش اور متحرک نہیں ہوتی۔ سچائیاں یہ ہیں کہ بدلتے ہوئے حالات کے سامنے ہم نے معاشرہ کو تربیت دینے کا کام نہیں کیا۔ اساتذہ بھی ذمہ دار نہیں ہیں۔ جب معاشرہ پر انحطاط کا دور آتا ہے تو معاشرہ کے ہر شعبہ پر اس کا اثر دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ ہندی کے بورڈوں کو دیکھ لیجئے ہر جگہ غلط ہندی لکھی ہوئی ملے گی۔ بہر حال محترمہ اشرف جہاں نے جن باتوں کا اشارہ کیا ہے وہ سچے ہیں اور جو تاریخی پس منظر اردو کا رہا ہے وہ جاگیردارانہ پس منظر آج ختم ہو چکا ہے

اس کی تلاش بے سود ہے۔ اب نئے تقاضوں کے ساتھ اردو ایک زندہ اور توانا زبان ہے۔

''ہم اردو کے ٹیچر ہوئے'' ایک انشائیہ ہی نہیں بلکہ ایک طنزیہ کتاب بھی ہے۔ اس میں تاریخ ادب اردو کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں سنجیدگی بھی ہے اور ملال بھی۔ ایک اچھی کوشش ہے۔ ع اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

نام کتاب: حریر دورنگ: شمس الرحمٰن فاروقی شاعر اور افسانہ نگار، مصنف: محمد منصور عالم، اشاعت: ۲۰۰۵ء
صفحات: ۱۹۸، قیمت: ۲۰۰ روپے، رابطہ: شب خون کتاب گھر، پوسٹ بکس ۱۳، الہ آباد (یوپی)
مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ۔

حریر دورنگ (شمس الرحمٰن فاروقی: شاعر اور افسانہ نگار) ڈاکٹر محمد منصور عالم کی ایک تازہ تخلیقی کتاب ہے۔ تخلیقی کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کیوں کہ نقاد کے لئے تحقیق کا کام آسان ہے لیکن منصور عالم نے شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی حیثیت کے علاوہ اُن کی شعری اور افسانوی تخلیقات کا جائزہ لیا ہے۔ اس کوشش میں انہوں نے تمہید اعرض کیا ہے کہ فاروقی اپنے متعلق لکھتے ہیں:

''شعر گوئی میرے لئے جنون یا تخلیلی جذبے کی شدید گری کا فوری اظہار بھی نہیں رہی۔''

لیکن منصور عالم نے جو جائزہ لیا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے جو نئے راستے طے کئے وہ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھے۔ اساس نظریاتی بنیاد پر بنائے جائیں یا روایت کی رد میں شروع ہوں ظاہر ہے اس کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت ہے اور محض جنون اس کے لئے کافی نہیں۔ ہر آدمی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ فاروقی نے جو راہ نکالی اس نے انہیں بڑا نقاد ہی نہیں بنایا بلکہ جدیدیت کے زیر اثر آنے والے حلقے کو عملی طور پر اپنے تخلیقی تجربوں سے راہ بھی دکھائی جو ایک مشکل و دشوار کام ہے۔ منصور عالم نے اسی انداز میں اُن کی تخلیقی کاوشوں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ فکشن سے متعلق فاروقی نے جو باتیں نقل کی ہیں جیسے Susan Sontag کی عبارت لکھی ہے جس میں کہا گیا ہے:

"A writer can never invent anything more beautiful and powerful than youri tynyanov."

ظاہر ہے کہ جو فکشن سے متعلق قول ہے وہ سچائیوں پر مبنی ہے۔ منصور عالم لکھتے ہیں: ''لاہور کا ایک واقعہ'' پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس افسانے نے افسانوی متن کی تنقید کا ایک الگ اور ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔''

اس میں شک نہیں کہ منصور عالم نے ان کے افسانوں کو گہرائی سے پڑھنے کی کوشش کی ہے اور تخلیقی و تحقیقی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی راہ نکالی ہے۔ شاعری میں فاروقی کے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ بھی اپنے آپ میں اچھوتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎ ٹھنڈا پتھر سب کا بستر ہونٹ میں کھلتے پھول آنکھ کے نم میں تھا تو تیری چیز بھی کوئی چیز۔

ان کی نظموں کے بارے میں منصور عالم لکھتے ہیں:

''فاروقی کی نظموں کے جو محاسن دکھائے گئے ہیں وہ جدید اردو شاعری میں کم نظر آتے ہیں۔ کچھ چیزیں البتہ مشترک ہیں مثلاً علامت سازی، پیکر تراشی، مبہم بیانی تقریباً ہر بڑے شاعر کے یہاں ہیں لیکن ایک لفظ کے متعدد معانی سے فائدہ اٹھانا، نامانوس معنی کو استعارہ استعمال کرنا، لفظوں میں معنوی اور صوری کشاکش رکھنا، پیکر کو زندہ، متحرک اور فطری

بنانا، صفات وخواص کو مفصل بیان کرنا، مغائرت پر مبنی استعارے بنانا، وزن و بحر سے شعوری طور پر سازشانہ کام لینا فاروقی کے امتیازات ہیں......"(ص:۱۰۴)

بہر حال ڈاکٹر محمد منصور عالم کا یہ وقیع کام ان کی فکری بصیرت اور دماغ سوزی کا آئینہ دار ہے۔

نام کتاب: مرے گیت اکیلے رہ گئے، شاعر: نذیر فتح پوری، اشاعت: ۲۰۰۴ء، صفحات: ۸۰، قیمت: ۶۰ روپے
رابطہ: اسباق پبلی کیشنز، ۱۰۲/بی/۲۳۰ سائر منزل، ومان درشن، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونہ۔۴۱۱۰۳۲
مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

نذیر فتح پوری کے گیتوں کا مجموعہ "مرے گیت اکیلے رہ گئے" میرے پیش نظر ہے۔ انہوں نے اپنے مجموعہ کی شروعات "دعائیہ" سے کی ہے جو مراٹھی گیت کی بنیاد پر ہے جسے انہوں نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔ گیت کا تعلق وہاں کی جڑی ہوئی مٹی سے ہوتی ہے۔ گیت کے اندر جتنی گہرائی ہو انداز اتنا ہی سادہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نبھانی آسان نہیں ہے لیکن نذیر فتح پوری نے دونوں کو ساتھ ساتھ نبھایا ہے۔ ان کے گیتوں کا لب ولہجہ بہت ہی پیارا ہے۔ "ابھی دکھ جھیل"، "نکل گیا کس اور"، "خط ہے کس کے نام"، "شام ڈھلی ہے گیت سنا"، "زندگی کے نام"، "بھجن"، "بیکاروں کا گیت"، "تم نہ آئے بارش آئی" وغیرہ گیت خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ نذیر فتح پوری ایک رسالہ "اسباق" کی ادارت بھی سنبھالے ہوئے ہیں اور ان کے مدیرانہ ملکہ کا شہرہ دور دور تک ہے۔ گیت لکھنا کوئی آسان نہیں ہے۔ گاؤں کی ہر خوشی کے موقع پر گیتوں کے الاپ سنائی دیتے ہیں۔ اُن الاپ کے اندر صرف زندگی ہی نہیں پورا معاشرہ جھلکتا ہے۔ ان کے گیتوں میں کیفیت بھی ہے، معاشرہ بھی ہے، کردار بھی ہے اور قدرت کے نظارے بھی جو گیتوں کو دل فریب بنا دیتے ہیں۔

نام کتاب: درد آشنا، شاعرہ: انوری بیگم، اشاعت: ۲۰۰۵ء، قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۱۲۸، رابطہ: ہاؤس نمبر ۸، روڈ نمبر ۱۵، ذاکر نگر، پوسٹ آزاد نگر، جمشید پور ۸۳۲۱۱۰ (جھارکھنڈ) مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

ڈاکٹر انوری بیگم کا شمار اردو کی معروف شاعرہ میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ "درد آشنا" میرے سامنے ہے۔ "چند باتیں" کے تحت اردو کے معروف نقاد پروفیسر وہاب اشرفی اس مجموعہ پر لکھتے ہیں: "میں نے محترمہ کو سختی سے ہدایت دی تھی کہ وہ زود گوئی سے بچنے کی کوشش کریں۔ اشاعت میں سخت رد و انتخاب کے مرحلہ سے گذریں، کوشش کریں کہ کوئی بھی مجموعہ سامنے آئے تو اس کی اشاعت کا جواز موجود ہو، لوگوں کو متوجہ کر سکے۔" وہاب صاحب کی یہ ہدایت کا نتیجہ ہے کہ بہت ہی سنوار کر اور چھان پھٹک کر اپنی غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ ان کا انداز دیکھئے: کسے فرصت ہے میرا حال پوچھے ☆ زمانہ خود میں بس کھویا ہوا ہے۔ ایک اور شعر دیکھئے: جب مسیحا نہیں کوئی پھر کیوں ☆ دل میں آزار لئے پھرتے ہیں۔ غزلوں میں نئے احساسات، تنہائی کا احساس، معاشرہ کی بے توجہی کا غم، اپنے آپ میں گم ہونا اور جس اعتماد کے ساتھ کسی بات کو پیش کرتی ہیں اس کیلئے جواز بھی ہوتا ہے، کہتی ہیں: ایک احساس تجھ کو پانے کا ☆ کیوں چڑھ جائے صلیب پر مجھ کو

وہ تمام پرانی روایتی فکر سے خود کو الگ رکھتی ہیں:

ہم آئینہ دکھائیں دوسروں کو	ہمیں دنیا دکھانا چاہتی ہے
اپنی قسمت ہے بکھرنا پھر بھی	خواب پلکوں پہ سجایا میں نے

انوری بیگم کا لہجہ اپنے انداز کا ہے۔ زود گوئی کا تو احساس ہوتا ہے اور انہوں نے جو بات بھی کہی ہے وہ اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہی ہے۔ ان کو اس بات کی فکر نہیں کہ معاشرہ کیا سوچتا ہے لیکن اس بات کی فکر ہے کہ معاشرہ کو کیا سوچنا چاہئے۔ اسی لئے وہ معاشرتی رویے سے کبھی مایوس نہیں ہوتیں بلکہ وہ تمام الجھنیں جو انسان کو Depression میں ڈال سکتی ہیں اس کو جھٹکے میں اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ کبھی کبھی تیور بغاوتی لگتا ہے لیکن جارحانہ نہیں۔ انوری بیگم ایک ایسی شاعرہ ہیں جو اپنا مخصوص ذہنی رویہ رکھتی ہیں اور کہنے کے سلیقے میں کہیں گنجلک انداز نہیں اپناتیں۔ بیجا، بھاری بھرکم الفاظ بھی غیر مناسب طور پر کہیں در آئیں تو اس کے لئے بھی انہوں نے غنائی پہلو کو حاوی رکھا ہے۔ اُمید ہے کہ اس شعری مجموعہ کی پذیرائی ادبی حلقوں میں ہوگی۔

نام کتاب: مردم گزیدہ (افسانے)، مصنف: اقبال حسن آزاد، اشاعت: ۲۰۰۵ء، صفحات: ۱۶۰، قیمت: ۱۵۰ روپے،
اشاعت: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۰۸، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔ ۶، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

معروف افسانہ نگار اقبال حسن آزاد کا افسانوی مجموعہ 'مردم گزیدہ' میرے پیش نظر ہے۔ انہوں نے اپنے مجموعہ میں جن افسانوں کو شامل کیا ہے وہ دس کی تعداد میں ہیں۔ ان کے لکھنے کا انداز اپنا ہے اس سے ان کی انفرادیت کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے کہانی کے کرداروں کو اور جس موضوع کو افسانوی رنگ دیا ہے وہ گہرے ہیں۔ اپروچ بھی ان کا قابل ستائش ہے نیز انہوں نے کہانی کے نئے انداز کو اپنایا ہے لیکن کہیں بھی ترسیل وابلاغ کی کوئی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ انہوں نے زندگی کو اپنے ذہن سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کا وہ پہلو زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے جس میں انسان کے اندر کی نفسیات اور باہر کی دنیا کی نفسیات دونوں کے مابین جو ٹکراؤ کی صورت ہے اس سے پیدا ہونے والے مسائل دلچسپی پیدا کردیتے ہیں اور افسانہ نگار خود اس میں Involved معلوم ہوتا ہے۔ ان کے چند افسانے خصوصاً ''چاندی کے تار''، ''بے خواب''، ''رونے والے''، ''نہیں ممی نہیں'' اور ''مردم گزیدہ'' قابل ذکر ہیں۔ ان کی یہ کتاب دیدہ وزیب ہے۔

نام کتاب: نظم نظم (شعری مجموعہ)، شاعر جمال اُویسی، صفحات: ۲۴۰، مطبوعہ: ۲۰۰۴ء، قیمت: ۲۶۰ روپے
رابطہ: اُردو لٹریری سوسائٹی، محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ۔

نوجوان شاعر اور نقاد جمال اُویسی کا شعری مجموعہ 'نظم نظم' نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو اس عہد کی ترجمانی، نئی نسل کی بے چینی، حالات کی بے یقینی، وقت کی بے اعتباری، سوچ کے بدلتے رشتے، ابھرتے ہوئے طوفان، ڈوبتے ہوئے احساسات، بکھرتی ہوئی کیفیت اور جلاتی ہوئی روایتی بے بسی کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ نظم کہہ لینا شاعری کی صف میں نام لکھانا یہ عام سی بات ہے لیکن فطری شاعر ہونا، محسوسات کو لفظ کا حقیقی پیرہن پہنانا جمال اُویسی کو کسی کاوش یا مشقت کے سبب حاصل نہیں ہوا ہے بلکہ وہ طوفان جو اس کے ذہن میں بار بار ڈوبتا ابھرتا ہے اس کو بغیر کسی نام کے شعری مجموعہ میں سجا کر پیش کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کوئی نام دینا بھی شاعر کے پھیلے ہوئے کینوس کا شعری تجربہ خود اپنی بھی نفی کرتا ہے اور اپنی پہچان بھی گم نہ ہو جائے اس کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ نظموں کو کوئی مخصوص پیرایۂ اظہار میں قید کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ ہر چھوٹی بڑی نظم اپنے انداز کی منفرد ہے۔ نظم کب شروع ہوتی ہے کب ختم ہوتی ہے۔ نظم کے کیا تقاضے ہونے چاہئیں اس بات پر کوئی توجہ نہیں ہے۔ بات کہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور بات کہیں پر ختم ہو جاتی ہے اور جب شعور کی رو خود ہی راہ بنانے لگتی ہے تو اس کی منزل کی تلاش بے سود ہے۔ ان کی ایک نظم 'روزن سے آکاش کو دیکھا' اگر یہ عنوان نہیں بھی ہوتا تو بھی ہم اُن گہرائیوں تک

پہنچ سکتے تھے جہاں جمال اُویسی ہمیں لے جاسکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ۔

اک دن میں نے/ رزن سے آکاش کو دیکھا/ گہرا/ نیلا/ مجھ کو لگا...../ آزادی کا کوئی پرچم/ حد نظر تک لہرایا۔

چھوٹی نظمیں جنہیں وہ مختصر نظمیں لکھتے ہیں اپنے اندر بے انتہا وسعت رکھتی ہیں۔ ایک نظم حاضر ہے ۔

جادو تری آنکھوں میں تھا/ یا مجھ کو کچھ دھوکا ہوا/ لیکن مرا سب لٹ گیا

''نزول شعر'' کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

مجھ کو آواز دی ستاروں نے خامشی کی ردا کو اوڑھے ہوئے

''شکست کے بعد'' کی نظم کا ایک ٹکڑا جو سوالیہ نشان ہے اور قابل غور بھی ۔

سزا یافتہ ایک مجرم کی مانند میں چور نظروں سے/ ہر آتے جاتے ہوئے آدمی کو/ فسردہ نگاہوں سے دیکھوں/ دریچہ میں بیٹھا رہوں/ مجھے کیا ملا؟

''ایک بے عنوان نظم'' میں جمال اُویسی مختلف زاویہ میں نظر آتے ہیں ۔

دور شور سگاں/ پاس تہی سی جاں/ اوڑھے سر پر بسیط آسماں/ میں چراغوں کا مدفن ہوا!

طویل نظموں؟؟ زندگی سراب آفریں، مجھ کو لے چل، موت سے ایک مخاطبہ'' میں بھی یکسوئی و انتشار کو ساتھ ساتھ پیش کرنا جمال اُویسی کا فن کارانہ، بیدار شعور اور فکری اتھل پتھل کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ مجموعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ جمال اُویسی کی ۱۹۷۸ء تا ۲۰۰۲ء تک کی نظمیں اس میں شامل ہیں۔ ان کی نظموں میں کہیں کہیں تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی بات اچانک رک سی گئی ہے جو آگے بڑھ سکتی تھی اس سے تاثر بھرپور پیدا نہیں ہوتا گرچہ Unity of Impression ہے لیکن Impression of Unity نہیں ہے۔ مجموعی اعتبار سے جمال اُویسی اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہیں۔ اس مجموعہ کی ادبی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

نام کتاب: قمر رئیس کی علمی و ادبی خدمات: تنقیدی جائزہ، مصنفہ: ڈاکٹر مسرت جہاں، صفحات: ۲۸۴، قیمت: ۲۰۰ روپے
مطبوعہ: ۲۰۰۴ء، تقسیم کار: دفتر شگوفہ، بیچلر کوارٹرس معظم جاہی مارکیٹ، حیدرآباد اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، مبصر: ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگہ

اُردو ادب میں پروفیسر قمر رئیس ایسا معتبر نام ہے کہ جن کے فکر و قلم کے رشحات، مستند حوالے کے کام آتے ہیں۔ انہوں نے بڑا کام کیا ہے ملک کے علاوہ بیرونِ ملک بھی اور پریم چند شناسی میں تو انہیں ممتاز مقام حاصل ہے۔ لہٰذا ان پر مختلف زاویے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زیر نظر کتاب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں اُردو کی لکچرار ڈاکٹر مسرت جہاں نے ایسی ہی کاوش کی ہے۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں پروفیسر قمر رئیس کا سوانحی خاکہ اور ان کی شخصیت کے مختلف گوشے کو پیش کیا ہے۔ باب دوم میں ان کی علمی و ادبی خدمات اور فکر و فن کی مختلف جہات سے روشناس کرایا ہے۔ باب سوم میں ترقی پسند تحریک کا خاکہ پیش کرتے ہوئے قمر رئیس کی وابستگی کے جواز اور ان کے رول کو نمایاں کیا ہے۔ باب چہارم پریم چند کی شخصیت اور فکر و فن پر ان کے گراں قدر تصنیفات، تالیفات اور مضامین کے محاکے پر مشتمل ہے۔ باب پنجم میں قمر رئیس کے مرتبہ، تحریک آزادی میں معروف انقلابی و اشتراکی تحریک سے جڑے نیاز حیدر کے کلام کے مجموعہ ''شعلۂ آوارگی'' اور ''نغمۂ جمالِ زمیں'' کا جائزہ پیش کیا ہے۔ بالخصوص شعلۂ آوارگی کے مقدمہ کو فوکس کیا ہے اور باب ششم میں ازبکستان کی

تہذیب وتمدن، ادب وثقافت پر نوشتہ قمر رئیس کی تصانیف، تالیفات اور تراجم کی افادیت ومعنویت کو اجاگر کیا ہے۔ دراصل ڈاکٹر مسرت جہاں نے اپنے پی۔ ایچ ڈی کے مقالہ کو کتابی شکل دی ہے اور آج کل بیشتر ڈگری حاصل کرنے کیلئے لکھے جانے والے مقالے مخصوص فارمیلیٹیو کی ادائیگی پر مکتفی ہوا کرتے ہیں، جنھیں تحقیقی وتنقیدی معتبریت کم ہی میسر آتی ہے لیکن ڈاکٹر مسرت جہاں کے مقالہ کو اس زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ گرچہ بحر تحقیق وتنقید کی شناوری میں محترمہ کو جو ہاتھ آیا ہے اسے یہاں پرو دیا ہے اگر غواصی کرنے کی جسارت کر کے کچھ دُرِ نایاب ہو رلیتیں اور تنقیدی بصیرت کو کچھ اور فروزاں کرتیں تو اس کی معنویت دو چند ہو جاتی کہ اس صورت میں بحث کے کسی دریچے کا کھلنا ممکن ہوتا اور پھر فکر وفن کی نئی تفہیم وتعبیر سامنے آتیں۔ تاہم قمر رئیس شناسی کے لٹریچر میں یہ ایک اضافہ ضرور ہے۔ اس کا دوسرا باب جاندار ہے اور چھٹا باب مجھے دلچسپ، معلومات افزا اور حاصل مقالہ معلوم ہوا۔ ادب کے شائقین خصوصاً طلبا کے لئے یہ کتاب مفید ہے۔

نام کتاب: سلاٹر ہاؤس، افسانہ نگار: یٰسین احمد، صفحات: ۱۶۸، اشاعت: ۲۰۰۵ء، ناشر: مکتبہ استعارہ نئی دہلی

رابطہ: جواہر پورہ، پوسٹ یاقوت پورہ، حیدرآباد، مبصر: فیاض احمد وجیہہ، عدل پور، دربھنگہ

سلاٹر ہاؤس، یٰسین احمد کے چھبیس افسانوں کا انتخاب ہے۔ اس سے قبل بائیس افسانوں کا مجموعہ ''گمشدہ آدمی'' ۲۰۰۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ زیر تبصرہ انتخاب کے بعض افسانے شاعر، آج کل، تمثیل نو، مباحثہ، نیا دور، سب رس، انشاء، سبق اردو ذہن جدید اور روشنائی جیسے جرائد ورسائل میں چھپ چکے ہیں۔ مجموعے میں ڈاکٹر مجید بیدار کا پیش لفظ بھی شامل ہے۔ جو افسانہ نگار اور ان کی اپنی تفہیم میں غیر معمولی ہے۔ یٰسین احمد نے اپنے تجربے میں جملہ انسانی مسائل کی ترجمانی کی ہے اور انسانی نفسیات کی نباضی میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔ ایسے تو افسانہ کئی سطحوں پر پڑھا جاتا ہے اور اپنے اندر بے پناہ قوت کا احساس بھی کرواتا ہے اس سے قطع نظر ان کی کہانی اکائی کی صورت میں انسان ہونے کا دُکھ، خالق کائنات کا عدل، ذمہ داری کا بوجھ، انسان کی تنہائی، انسانی ہمدردی، علمی بے قدری، ایمانداری، بچوں کی ذہنی اپج اور اس کی نفسیات وغیرہ کا شدت سے احساس کرواتی ہے۔ احمد کی فکری سالمیت (Wholeness) دو حصوں میں منقسم ہے۔ دراصل ان کا کہانی کار اپنے اندر کے فرد کو افسانے میں منعکس کرتے وقت اس فرد کو بھی شامل کر لیتا ہے جو کردار کو انفرادی اور فطری صورت عطا کرنے کے بجائے مصنوعی فضا قائم کرنے لگتی ہے۔ اسی کے باعث کردار کی تربیت کرتے ہوئے ان کا 'میں' تیور غالب ہو جاتا ہے جو افسانے میں کسی طور پر روا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں جب تخلیق کار مشورہ دینے کے عمل سے گذرنے لگے تب افسانے کا مزاج کردار کی فکری سالمیت کو برداشت کرنے کی قوت کھو دیتا ہے۔ چنانچہ تخلیقی متن (ماجرا) کردار کی گرفت میں رہے تو کھنگالا ہوا ادب ترتیب پاتا ہے۔ جب کہ مصنف کی گرفت اس بات کا اشارہ ہے کہ تخلیق تمام ہو چکی اب کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ پتا نہیں ہمارے تخلیق کار لکھنے سے زیادہ کیا نہیں لکھنا چاہئے پر محنت اور قوت صرف کیوں نہیں کرتے جاننا چاہئے کہ تجربے کو دھونا اور مانجھنا دشوار گذار عمل ہے۔ لیکن تخلیقی ادب میں اس کی حیثیت بنیاد گزار کی ہے۔ پھر کہنا چاہئے کہ بعض افسانوں کے اختتامیہ میں در آئے چند سطروں کو ناگفتہ (جو قاری کے ذہن میں مکمل ہوتا ہے) اور بعض میں ترتیب کا لحاظ رکھا جاتا تو ان کی ہنرمندی ذومعنی ہو جاتی۔ اس مجموعے میں شامل افسانے 'سلاٹر ہاؤس'، 'انسانوں کا جنگل'، 'پابہ جولاں'، 'تیسرے پہر کی دھوپ'، 'انارکلی کی موت'، 'جنت کا حقدار'، 'موہنی اور پنّن' کا واقعاتی پہلو توجہ کا مرکز ہے۔ سرورق Suggestive اور قیمت مناسب ہے۔

راہ و رسم

❁ ڈاکٹر انور سدید (لاہور): سہ ماہی "تمثیل نو" نظر نواز ہوتا رہا ہے۔ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو اس سے قبل خط نہ لکھ سکا۔ بڑی وجہ تو ضعفِ پیری ہے جس کی موجودگی میں صحافت کا کام روزانہ کرنا پڑتا ہے۔ زندگی کے لئے نیا پانی حاصل کرنے لئے روزانہ نیا کنواں کھودنا ضروری ہے۔ میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں کہ آپ نے میری کوتاہی کو نظر انداز کیا اور 'تمثیل نو' کی ترسیل جاری رکھی۔ اور اس طرح بھارت میں ہونے والے ادبی کام سے مجھے باخبر رکھا۔ اس پرچے کی ایک خصوصی خوبی یہ ہے کہ اس میں نظیر صدیقی کے خطوط بنام ڈاکٹر امام اعظم چھپ رہے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کا نام نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ آپ ان کی یاد تازہ کرتے رہتے ہیں۔ 'تمثیل نو' کا اداریہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' بھارت کی پوری ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرتا ہے۔ میں اس کا ایک ایک لفظ بالاستیعاب پڑھتا ہوں اور اپنے مضامین میں اس سے استفادہ بھی کرتا ہوں۔ اس وقت میرے پیش نظر جلد چہارم کا شمارہ ۱۵۔۱۶ (اکتوبر ۲۰۰۴ء تا مارچ ۲۰۰۵ء) ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا سلسلہ وار مضمون 'ایک لہر نئی نئی قسط ۱۴' ان کے سابق مضامین کی طرح بے حد خیال افروز ہے۔ ان کا یہ سوال سوچ کو انگیخت دیتا ہے کہ "ایک اعلیٰ درجے کا تخلیقیت پرور نقد پارہ ہمیں کیوں بیدار کرتا ہے" اس بحث میں انہوں نے نظام صدیقی صاحب کے تصورات کا معنی پرور اعتراف کیا اور ان پر ایک نئی بحث ابھاری ہے۔ اس بحث کو مزید آگے بڑھنا چاہئے۔ سید منظر امام نے دربھنگہ کی ادبی یادوں میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ مضمون جاری ہے۔ اس لئے اب اگلے شمارے کا انتظار رہے گا جو شاید اب تک چھپ چکا ہو۔ اسی نوع کا ڈاکٹر منصور عمر کا مقالہ "اکیسویں صدی میں دربھنگہ کی ادبی پیش رفت" بھی معلومات افزا ہے۔ اس مقالے سے کئی نئی کتابوں کی تفصیل معلوم ہوئی۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رسالہ 'تمثیل نو' اردو ادب کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔

❁ مجتبیٰ حسین (حیدرآباد): "تمثیل نو" پابندی سے مل رہا ہے۔ دن بہ دن ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ درمیان میں دو تین مرتبہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ جب بھی دہلی جاتا ہوں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے آستانہ پر اور مظہر امام صاحب کے گھر پر حاضری ضرور دیتا ہوں۔ آپ کا ذکر مؤخر الذکر آستانہ پر ضرور ہوتا ہے۔ منصور عمر کے قطعات تاریخ بضمنِ وفات لبھاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس کے لئے مرنا ضروری ہے۔ دیکھئے کب موت آتی ہے۔

❁ ستیہ پال آنند (امریکہ): "تمثیل نو" کا تازہ شمارہ مجھ تک پہنچ گیا۔ آپ کی آنند نوازی کا جواب نہیں کہ آپ اتنے روپے خرچ کر کے بذریعہ ہوائی ڈاک رسالہ بھجواتے ہیں۔

❁ منصود الٰہی شیخ (یو۔ کے): آپ کا شمارہ ۱۷۔۱۸ ملا۔ رسالہ خوبصورت ہے اور اس کا مواد فکر و نظر کے دائروں کی وسعت کے لئے بڑی حد تک صحت مندانہ "خوراک" کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا ہر نئے شمارے کے ساتھ نئی نئی کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین۔

❁ سہیل غازی پوری (کراچی): سہ ماہی "تمثیل نو" شمارہ اپریل تا ستمبر ۲۰۰۵ء موصول ہوا۔ یہ رسالہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اس کی بازگشت تو یہاں بھی سنائی دی تھی مگر دیکھنے کا اتفاق آج ہوا۔ 'تمثیل نو' جاذب نظر اور معیاری نظر آیا۔ نئے نئے لکھنے والوں سے ملاقات بھی ہوئی۔ ابھی رسالہ مکمل طور پر نہیں دیکھ سکا۔ بہرنوع آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتنے خوبصورت رسالے کی اشاعت پر مبارکباد قبول کیجئے۔

❁ سید احمد شمیم (جمشید پور): اردو ادب کے رجحان ساز کی قرأت سے خوش نہ ہو سکا۔ کیا یہ مناسب نہیں ہوتا کہ آپ نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تینوں کو اپنے دائرے میں لے لیا ہوتا۔ ترقی پسندی ممکن ہے بطور تحریک ختم ہو گئی ہو مگر دم خم تو

جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں بھی نہیں رہا۔ ہاں ترقی پسندی آج کی تازہ ضرورت ہے۔ پہلے سے زیادہ۔ فاروقی اور نارنگ سے پہلے سجاد ظہیر کا ذکر لازمی تھا۔ اس طرح یہ تحریکی مثلث مکمل ہو جاتا۔ سجاد ظہیر کی دانشوری، خلوص، بصیرت اور تخلیقی صلاحیت سے اغماز سخت بے انصافی ہے۔ یہ سجاد ظہیر ہیں جنہوں نے ''انگارے'' کے ذریعے اردو فکشن کو نئی سمت دی۔ 'لندن کی ایک رات' اُردو کا پہلا ناولٹ لکھا۔ اردو میں نثری نظموں کا پہلا مجموعہ ''پگھلا نیلم'' (آزاد نظموں کا نہیں) شائع کیا۔ نثری نظموں کی مخالفت میں ہمارے بنیاد پرست ناقدین جو بھی کہیں شعراء کا ذکر چھوڑیئے خود معتبر نقادوں نے نثری نظم کے مجموعے شائع کئے ہیں۔

(تحریک اور رجحانات کے درمیان جو فرق ہے یہ اظہر من الشمس ہے۔ جب کوئی تحریک ختم ہو جاتی ہے تو اس کے درمیانی وقفے میں چھوٹے بڑے رجحانات ابھرتے رہتے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت تحریک نہیں بلکہ رجحان ہے اور رجحانات تحریک کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے!..... مدیر)

❁ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی (بھاگلپور): ایک اور دھانسو شمارہ پر مبارکباد قبول کریں۔ 'تین رجحان ساز' جیسی سوچ اور 'نظریاتی افکار' اور 'نظریاتی مباحث' کے تحت تفصیلی آراء سے یہ شمارہ متنوع بن گیا ہے۔ بلکہ ''تمثیل نو'' مواد کے اعتبار سے رجحان ساز بنتا جا رہا ہے۔ ''تمثیل نو'' کے گذشتہ (بلکہ تازہ) شمارہ پر 'قومی تنظیم' میں ڈاکٹر قاسم فریدی جائزہ لیتے ہی تھے، اب حقانی القاسمی جیسے بیحد ذہین اور بہت ہی پڑھے لکھے ناقد بھی جائزہ پیش کرنے لگے ہیں، یہ بڑی بات ہے۔ اندر سنگھ ورما اور دوسروں کے لئے عرض ہے کہ 'اقبال اور انور شیخ' پر گفتگو کرتے وقت انور شیخ کی لندن میں چھپی ضخیم کتاب 'فکر اقبال پر ایک تنقیدی نظر' ضرور مطالعہ کر لیں۔ اس کتاب کی قیمت تین سو روپے ہے۔ بیشتر حضرات بغیر کتاب پڑھے ادھر ادھر سے جڑ جڑ کر اپنی ناپختہ رائے پیش کرتے رہتے ہیں جس سے بحث کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اندر سنگھ ورما نے ''اسباق'' سے اقتباس پیش کر کے قارئین کی فکر کو مہمیز کیا ہے۔ حالاں کہ ''اسباق'' سے یہ بحث ہفتہ وار ''بیباک'' مالیگاؤں میں چلی گئی تھی۔ کئی اشاعت میں گرما گرم گفتگو رہی، یہاں تک کہ ایڈیٹر ہارون صاحب نے اعلان کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا۔ لیکن نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔ اندر سنگھ ورما یہ بحث ''تمثیل نو'' میں لے آئے ہیں۔ کہیں حاجی مشرف امام والی گفتگو پھر نہ دہرائی جائے۔ سید مظفر شعیب ہاشمی کی نئی کہانی ''خوش فہمی'' میں نے دلچسپی سے پڑھی، ان کی ہُنت کاری میں سحر آفرینی ہے۔ کمال بصیرت اور کمال محبت سے بھرپور یہ کہانی کمال حسیت سے لبریز ہے اور سفر مدام سفر کی تیز رسا اور دوربین نگاہی کے گوشہ کو منور کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی جاسوسی اور تاریخی ناولیں پڑھتے رہے ہیں۔ وہ اسی طرح کی کہانیاں لکھتے رہے تو بہت جلد ''منفرد'' بن جائیں گے، ہاں، کہانی کے عنوان سے میں متفق نہیں ہوں۔

❁ عشرت ظفر (کانپور): آپ کا مقتدر جریدہ ''تمثیل نو'' شمارہ ۱۷-۱۸ نظر نواز ہوا۔ اس خوبصورت جریدہ کے مطالعہ سے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا۔ مضامین علمی تعمق و بصیرت کے غماز و آئینہ دار ہیں آپ نے بہت اچھی بحث چھیڑی ارباب قلم کو چاہئے کہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

❁ پروفیسر رئیس انور (دربھنگہ): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ نے اس کے سرورق پر عنوان لگایا ہے۔ 'اردو ادب کے رجحان ساز' اور نیچے اردو ادب کے تین Stalwarts کی تصویریں شائع کی ہیں پھر ان کے تعلق سے کئی مضامین بھی شامل کئے ہیں۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ شمس الرحمن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کو یقیناً رجحان ساز کہا جائے گا کہ ان کی تحریروں میں وہ تاب و تواں ہے جس سے کئی پیڑھیاں متاثر ہوئی ہیں۔ اپنے فکری وفنی رویے میں تبدیلی کرنے پر مجبور ہوئی ہیں اور ادب کے تازہ کار منظر نامے کا سبب بنی ہیں۔ اس لئے پچھلی ادبی تحریکیں ہوں یا جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے رجحان، نہ ان کی افادیت سے

انکار کیا جاسکتا ہے نہ ان کے مبلغین کی خدمات سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے۔ اس کا اعتراف کرتے ہوئے آپ نے بہت اچھا کیا کہ ایک شمارے میں اسے highlight کیا۔ جہاں تک مظہر امام کا تعلق ہے، وہ ایک بڑے شاعر ضرور ہیں اردو ادب میں ان کی مستقل پہچان بھی ہے مگر انہیں رجحان ساز کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ کھلا ذہن رکھتے ہیں، وسیع مشرب ہیں، ادبی تغیرات کو انسانی فطرت کا عطیہ سمجھ کر ان کا استقبال کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ ترقی پسندی اور جدیدیت سے ہوتے ہوئے مابعد جدیدیت کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کی ایجاد کی ہوئی صنف آزاد غزل کسی رجحان کی نمائندہ نہیں ہے۔ آزاد غزل کیا کوئی بھی صنف کسی ایک تحریک یا رجحان تک محدود نہیں رہ سکتی۔ آزاد نظم اور نثری نظم کو دیکھئے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے زمانے میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں اور آئندہ بھی ادبی لہروں کو سموتی رہیں گی۔ ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ آزاد غزل کوئی ایسی معروف صنف بھی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ رواج تو آزاد اور نثری نظمیں کہنے کا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی کا یہ جملہ گمراہ کن ہے۔ ''اُردو میں آزاد غزل لسانیاتی عمل ہے'' (لسانیاتی کہ لسانی؟) یہ جملہ اس امر کی بھی وضاحت چاہتا ہے کہ پابند غزل کیا لسانی عمل نہیں ہے اور اگر ہے تو پابند غزل اور آزاد غزل کے لسانی عمل میں کیا فرق ہے؟ بہر حال بات صرف اتنی سی ہے کہ آزاد غزل ایک ادنیٰ ہیئتی عمل ہے۔ منصور عمر نے اپنے مضمون میں غالبؔ کے مشہور شعر کے حوالے سے لکھا ہے۔ ''مظہر امام نے آزاد غزل کا تجربہ کر کے غالبؔ کے خواب کی تعبیر پیش کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔'' بھلا آزاد غزل میں بیان کی وسعت کی کہاں گنجائش ہے! اشارے، کنائے، علائم اور استعارے سے جس طرح پابند غزل کے شعروں میں کام لیا جاتا ہے، اسی طرح آزاد غزل میں بھی بلکہ اس میں تو کفایت لفظی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے اور دو مصرعے کی جگہ ارکان میں تخفیف کر کے ڈیڑھ پونے دو مصرعے ہی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ غالبؔ کے تصور میں تو نظم کا ہیولیٰ تھا۔ بہر حال آپ نے جس انداز سے شمارہ نکالا ہے وہ قابل صد ستائش ہے۔

❁ اندر سنگھ ورما (گڑگاؤں): میرے لئے یہ امر باعث طمانیت و ممنونیت ہے کہ آپ نے حسب توقع صحافتی ایمانداری، وسعت قلبی، مدیرانہ معقولیت پسندی اور انتہائی ذمہ داری سے کام لیتے ہوئے میرے مراسلے کو'مدیر کے ساتھ مکالمہ' کے طور پر 'تمثیل نو' (شمارہ ۱۷، ۱۸) میں شائع فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے مختصر ادارتی نوٹ میں اختلاف کی تمام گنجائشیں موجود ہیں، کیا خیال ہے؟ کا اضافہ کر کے نہ صرف قارئین کو بلکہ ان تمام سنجیدگی پسند دانشوروں کو جو'تمثیل نو' سے وابستہ ہیں یا نہیں ہیں، دعوت عام دی ہے کہ وہ مکالمے میں اختلاف کی جتنی جی چاہے گنجائشیں نکال سکتے ہیں۔ پورے مکالمے میں واقعتاً اول تا آخر متعدد نکات اختلاف ظاہر بھی ہیں اور بین السطور پوشیدہ بھی۔ تاہم اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ'تمثیل نو' کے آئندہ شماروں میں اس کے ذی شعور، اور ذی وقار قارئین نیز دانشور حضرات کتنے ترش لہجے میں اور کتنی تلخ نوائی سے کون کون سی اختلافی گنجائشوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔'میں بلا کسی تردد کے ایمانداری سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے مراسلے (مدیر کے ساتھ مکالمے) میں جو لکھا، وہ پوری ذمے داری اور اس احساس کے ساتھ لکھا کہ ''اچھا بابا'' پر تبصرہ والا حصہ لازماً غیر ضروری مباحثہ کا آغاز کر سکتا ہے لیکن ایک لحاظ سے یہ ضروری تھا بھی۔ کیوں ضروری تھا؟ اس کا جواب و جواز مراسلے میں موجود ہے۔'تمثیل نو' کے ذہین، بالغ النظر اور ذی وقار قارئین اور دانشوروں کی جانب سے متوقع'سنگ باری' سے مجھ کو جو بھی خفیف یا شدید ضربات پہنچیں گی، میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوں لیکن خدشہ یہ بھی لاحق ہے کہ کہیں آپ کی صحافتی ایمانداری کے لئے آپ کو مورد عتاب نہ ٹھہرا دیا جائے کہ آپ نے مراسلہ شائع کیا ہی کیوں جب کہ آپ کو اسے ناقابل اشاعت قرار دے کر یکسر مسترد کر دینے کا استحقاق تھا۔ اب چوں کہ آپ نے ''یاران نکتہ داں کو صلائے عام'' دے ہی دیا ہے تو دیکھنا چاہئے کہ کیا اچھا برا واقع ہوتا ہے۔

❁ ابواللیث جاوید (نئی دہلی): ''تمثیل نو'' کا حالیہ شمارہ ملا۔ اُردو ادب کے تین معماروں کی تخلیقات قابل تحسین ہیں۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آزادغزل کے حوالے سے جمال اُویسی کا مضمون کافی واضح اور صاف ہے۔ حقانی القاسمی اپنی منفرد تحریر کے لئے معروف ہیں۔ تمثیل نو اب ادبی رسائل میں نہایت معتبر اور پُروقار ہوگیا ہے۔ جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا کرے یہ رسالہ اُردو زبان وادب کی لاج بنا رہے۔ برادرم عبدالمنان طرزی نے بڑی قلیل مدت میں اپنی شاعری کا سکہ پوری ادبی دنیا پر جمالیا ہے۔ اُن کی شہرت کا Credit بھی تمثیل نو اور امام اعظم کو ہی جاتا ہے۔

❁ اقبال انصاری (دہلی): نیا شمارہ موصول ہوا۔ محترم حسن امام دردؔ کی حمد اس لائق ہے کہ اسے اہتمام کے ساتھ سرورق پر شائع کیا جاتا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی ''جدیدیت'' ''فرضی'' ''قلعے سر کرنے کی'' F.I.R. گی۔ اس کے برعکس گوپی چند نارنگ کی ''مابعد جدیدیت'' آج کی سلجھی ہوئی دانشوری ہے، جہاں ابہام نہیں، افہام ہے، جہاں Whimsical Supposition نہیں Neutral Observation ہے۔ محترم مظہر امام، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر منصور عمر، ابوذر ہاشمی، جمال اُویسی اور حقانی القاسمی نے بھی بلند پایہ ادبی مضامین سپرد شمارہ کئے ہیں۔ مظہر امام صاحب کا مضمون ''آزادغزل'' صرف ڈیڑھ صفحات میں سمٹا ہوا ہے، لیکن معنوی اور ادبی اعتبار سے بے حد بسیط ہے اور آزادغزل کے بارے میں پھیلی ہوئی کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتا ہے۔ شمارے میں تین ہی نظمیں ہیں اور تینوں بڑی خوبصورت ہیں۔ ڈاکٹر انوری بیگم کی ''بادِ بہاری'' دل میں بہت اندر تک اتر تی چلی جاتی ہے۔ عبداللہ خلیلی کی ''پردیس آگیا تھا کمانے کے واسطے'' بڑے خلوص سے متاثر کرتی ہے۔ اسرار جامعی کی چھ مصرعوں والی ''شاعری کی شین'' بہت مزہ دیتی ہے۔ محترم منظر شہاب کی غزل کو غزلوں کے گوشے میں اول مقام دے کر آپ نے اپنی ادب شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر عبرت بہرائچی، علیم صبا نویدی، ڈاکٹر شمس مدنی، اختر شاہجہاں پوری، راشد جمال فاروقی، اور رفیق شاہین کی غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ شمارے کی ایک بہت اہم تحریر اندر سنگھ ورما کا ''ایک مکالمہ مدیر کے ساتھ'' ہے۔ بڑا حوصلہ چاہئے ایسا مکالمہ تحریر میں لانے کیلئے اور بڑا دم چاہئے اسے شائع کرنے کے لئے۔

❁ تسنیم فاروقی (لکھنؤ): ''تمثیل نو'' (شمارہ ۱۷، ۱۸) خنکی نگاہ ہوا۔ اردو ادب کے تین رجحان ساز چہروں کی تصاویر سے رنگ رنگ ٹائٹل اپنے آخری صفحے تک ایک جامع ادب نامہ ہے۔ 'مجھے کچھ کہنا ہے' آپ کے اداریے نے وضاحت، صراحت اور تعزیت کے اہم پہلوؤں کی انجام دہی بڑے موثر انداز میں انجام دی ہے، ڈاکٹر منصور عمر صاحب کی فن تاریخ گوئی کے سائے سائے اہم شخصیات کی سوگواریاں بھی نظر سے گزریں۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ جدیدیت (جناب شمس الرحمٰن فاروقی)، مابعد جدیدیت (پروفیسر گوپی چند نارنگ)، آزادغزل (جناب مظہر امام) کے نگارشات سے بہت کچھ سرمایۂ ادبیات ملا۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے دو دو بار پڑھنا پڑا۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ''کا فکری اور عملی ڈسکورس'' تو یوں پڑھا کہ اُن کے اجتہاد اور ادبی کارناموں پر غور کرنا میرا ایک خاص ذوق ہے۔ ایک مکالمہ مدیر کے ساتھ (اندر سنگھ ورما) میرے خیال سے زہرانگیز مکالماتی اقدام ہے۔ اس نوعیت کے جذبات اُردو کے قومی ادب کی فضا پر چنگاریاں برسانے کے مترادف ہوا کرتے ہیں دلوں کی گھٹن دور کرنے کے وسائل قلمی مسلک رکھنے والوں کے شایانِ شان نہیں۔ صرف سیاست مذہب کی چھاؤں دکھا کر کسی اقتدار کی چٹان پر سربراہی تو کرسکتی ہے مگر دلوں اور زبانوں پر قابض ہو جانا ناممکن ہے۔ یہ عرفان صرف ادب کو حاصل ہے۔ حوالے کے انداز میں شریعت کی دھمکیاں تو ہیں ہی علامہ اقبال پر مرزائیت کے الزام کا رنی ول، مباحث ودلائل کے لئے عالمی اشاروں کی دھرپچ کا یہ وکیلانہ بستہ بیشتر شقوں پر مبنی ہے 'تمثیل نو' کی علمی عدالت میں ترکی بہ ترکی جوابات کی اشد ضرورت ہے۔ (قلم کا بے لاگ انصاف چاہئے) ادب صرف انسانیت کے لئے تخلیق ہوتا ہے کرداریوں بھی فرضی ہوا کرتے ہیں اور یوں بھی یہ عہد سعادت حسن

منٹو اور عصمت چغتائی جیسے لکھنے والوں کا بہترین ہم نوا ہے۔ ادارہ توجہ دے اور تشفی بخش انداز میں اس کی گرہیں کھولے تا کہ گتھیاں سلجھیں تبصروں کے صفحات قابل تحسین ہیں تبصرے نمٹائے نہیں گئے ہیں بلکہ حقیقی طور پر دانشورانہ فیصلوں کے حامل ہیں۔ کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ نظم ہو یا نثر دونوں سے مزین صفحات معیاری ہیں۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ آپ کا رسالہ جو کتابی سائز بھی رکھتا ہے کسی بہترین معتبر اور مستند عصر آفریں کتاب سے کسی طرح کم نہیں۔

❁ افتخار اجمل شاہین (کراچی): ''تمثیل نو'' موصول ہوا۔ پرچہ ماشاء اللہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر اسی معیار اور آب وتاب سے یہ پرچہ شائع ہوتا رہا تو نہ صرف یہ بہار کے ادبی رسالوں کی تاریخ میں بلکہ ہندوستان کے ادبی رسالوں میں ایک اہم اور مقتدر مقام حاصل کرے گا۔

❁ شاہد جمیل (سہرام): ''تمثیل نو'' کا شمارہ نمبر ۱۷۔۱۱۸ اپنے سابقہ شماروں کی مانند کئی اعتبار سے متوجہ کرتا ہے۔ بلاشبہ سرورق پر فاروقی، نارنگ اور امام جیسی عہد ساز اور رجحان ساز شخصیات کے تعلق سے آپ کا اعترافی کلام، اداریے میں آپ کا نوٹ اور 'نظریاتی افکار' کے تحت ان حضرات کی تحریریں 'اردو ادب میں ان کے گراں قدر Contribution کو بہت حد تک Focus کرنے میں کامیاب ہیں۔ یہ تینوں شخصیات بہر حال جدید اردو ادب کے عظیم مینار ہیں۔ لیکن ان سب سے قبل ایک اور نام ہے اور وہ نام ہے وزیر آغا! غالباً آپ Urdu global level یا برصغیر کے تعلق سے باتیں کرتے تو یہ چاروں نام آ ہی جاتے! 'فکری اور عملی ڈسکورس' کے عنوان سے مناظر عاشق صاحب کا مضمون آزاد غزل کے حوالے سے ایک نئی چونکا دینے والی سمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان کے اس جملہ ''آزاد غزل میں فنی خود مختاری کی اتنی اہمیت نہیں ہے، جتنی قاری کی قراءت اور لسانیاتی عمل اور فن پر ہے'' سے آزاد غزل کے مبحث پر ایک نئے زاویے سے روشنی پڑتی ہے۔ اس شمارے کی منظوماتی چیزوں میں ستیہ پال آنند کی نظم ''کلید کل' ایک عمدہ نظم ہے اور شاید ایک بڑی نظم بھی۔ غزلوں کے انتخاب میں مزید عرق ریزی اور جاں فشانی کی ضرورت ہے۔ ''اعضائے رئیسہ میں تھکن دیکھ رہا ہوں!'' (ص ۸۰) جیسی لفظیات اور متن والے اشعار چھاپنا میرے نزدیک مستحسن نہیں۔ یوں بھی یہ ادب کی شاعری نہیں۔ تبصرے تمام کتاب پڑھ کر لکھے گئے معلوم ہوتے ہیں، جو خوب ہیں۔ اس بار کے خطوط میں طلحہ رضوی برق صاحب کا خط مبتدیوں کے لئے ہدایت نامے کا کام کرے گا۔ لیکن نیر ارمان کی غزل (تمام شہر ہی دشمن ہے، کیا کیا جائے) کی تقطیع میں وزن ''مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن'' اور قافیہ ردیف ''دشمن ہے کیا کیا جائے، بدظن ہے کیا کیا جائے'' کے حوالے سے تمام ترصحیح ہدایتوں کے باوجود خود برق صاحب کی نظر بھی چوک گئی ہے اور ''اب کے پھر گھات میں دشمن ہے، کیا کیا جائے'' کا وزن وہ ''فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن'' لکھ گئے ہیں، جب کہ لکھنا چاہیے تھا ''فاعلاتن فعلاتن مفاعلن فعلن'' (گویہ کوئی بحر نہیں رکھتا) واضح ہو کہ ارمان کی غزل کی ردیف میں ''کیا کیا جائے'' (क्या किया जाए) کے الفاظ آتے ہیں نہ کہ ''کیا کیا جائے'' (किया क्या जाए)

❁ ڈاکٹر مجید بیدار (حیدر آباد): ''تمثیل نو'' نے اپنا تازہ شمارہ ''اردو ادب کے رجحان ساز'' کے زیر عنوان مرتب کیا ہے اور ان رجحان ساز شخصیتوں میں شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور مظہر امام کو شامل کیا ہے اور بلاشبہ ان ہستیوں کو اردو کے رجحان ساز قرار دینا حقیقت کے اعتراف کے مترادف ہے۔ یہ اردو کا غالباً پہلا جریدہ ہے جو انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے عنوان سے پیش کردہ اداریہ میں ڈاکٹر امام اعظم نے جدیدیت کے امام شمس الرحمن فاروقی، مابعد جدیدیت کے اسرار ورموز کے پارکھ گوپی چند نارنگ اور آزاد غزل کے بانی مظہر امام کی خدمات اور کارناموں کا احاطہ کرتے ہوئے انہیں اردو ادب کے رجحان ساز ادیبوں میں شمار کیا ہے جو حقیقت کا برمحل اعتراف ہے۔ سہ ماہی جریدہ ''تمثیل نو'' حمد و نعت۔ خطوط، نظریاتی افکار

جیسے جدیدیت مابعد جدیدیت اور آزاد غزل پر شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور مظہر امام کے خیالات سے مالا مال کیا گیا ہے۔ جس کے ساتھ ہی نظریاتی مباحث کے عنوان سے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر منصور عمر، ابوذر ہاشمی، جمال اُویسی اور حقانی القاسمی کے پر مغز مقالے شامل کیے گئے ہیں۔ گلشن کہنہ کے ڈاکٹر دلدار جہان آبادی پر لکھے ہوئے خاکے کے بعد ''دربھنگہ'' پر پروفیسر سید منظر امام کے تاثرات شامل رسالہ ہیں۔ جس کے بعد اسرار اکبرآبادی، میمونہ بیگم اور مناظر عاشق ہرگانوی کی خودنوشت سوانح کی پندرہویں قسط کو جگہ دی گئی ہے۔ جاوید اختر چودھری، سید مظفر شعیب ہاشمی اور نرگس جہاں کے افسانے رسالے کی زینت بڑھانے کا کام انجام دیتے ہیں۔ اس شمارہ کے مخصوص شاعر راز سیوانی کا تعارف فاضل مدیر نے پیش کیا ہے۔ جس کے بعد دس شعراء کی مختلف عنوانات پر نظمیں اور ۳۸ شعراء کی غزلوں سے مزین رسالہ ''تمثیل نو'' اندر سنگھ ورما کے مضمون ''مکالمہ مدیر کے ساتھ'' کی نشاندہی کرتا ہے۔ جسے مکتوب مکالمہ کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے اور ادارہ نے خود واضح کردیا ہے کہ اس مکالمہ سے اختلاف کی تمام گنجائشیں باقی ہیں۔ اس مکالمہ میں ماہرین اقبالیات اور اقبال پر انجام دیے جانے والے کام پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کئی اہم سوالات پیش کیے گئے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اندر سنگھ ورما نے تلاش و تجزیے کے ساتھ جس کڑی تنقید کو وسیلہ بنایا ہے اس پر نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ رسالہ ''تمثیل نو'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس جریدہ نے اردو کے تین اہم رجحان ساز افراد کی خدمات کا اعتراف کر کے یہ ثابت کردیا کہ فاروقی صاحب بیشک جدیدیت کے امام اور نارنگ صاحب عہد نو کے تغیر نواز جب کہ مظہر امام آزاد غزل کے بنیاد گذار۔ سرورق پر تینوں رجحان ساز اشخاص کی تصویریں شائع کر کے ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی مدیرانہ صلاحیت کا خوب استعمال کیا ہے۔ خوبصورت ہمہ رنگی سرورق نگاہوں کو اپنی جانب مرکوز نہ کرلینے میں کامیاب ہے۔ اردو ادب کے اس جریدہ کا شعر و ادب کے شیدائیوں کے گھروں میں محفوظ ہونا ضروری ہے۔ ایسے رسالے بلاشبہ ادبی دستاویز کی حیثیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر امام اعظم کا یہ کارنامہ ادبی صحافت میں یادگار کا درجہ رکھتا ہے۔

❁ رؤف خیر (حیدرآباد): مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا ریجنل ڈائرکٹر (دربھنگہ) ہونا مبارک۔ آپ جیسے فعال صاحب قلم ہی کو یہ منصب زیب بھی دیتا ہے۔ 'تمثیل نو' ملا۔ حسب معمول بھرپور ہے۔ مضامین اپنی جگہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آزاد غزل کے مباحث بہت پرانے ہو گئے ہیں پھر بھی مزہ دیتے ہیں۔ آزاد غزل پر میرا مضمون ''دکن کے رتن......'' میں ملاحظہ فرمائیے بلکہ چھاپ دیں تاکہ تمثیل نو کے قارئین آزاد غزل کے بارے میں ایک اور نقطۂ نظر سے واقف ہوسکیں۔ مظہر امام نے آزاد غزل کا ایک شعر دے کر لکھا ہے کہ اسے پابند کیا جائے تو مفہوم ہی خبط ہو جائے گا۔ ان کا شعر ہے ؂

صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اڑ جاتے تھے لفظوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی رات

میرا خیال ہے کسی بھی آزاد غزل کے کسی بھی شعر کو بڑی آسانی سے ہم وزن کر کے زیادہ بامعنی بنایا جاسکتا ہے۔ مذکورہ شعر میں ''صبح کا تڑکا'' کہنے کے بجائے ''تڑکا'' کہنا کافی ہے اور دوسرے مصرع سے یہ نہیں کھلتا کہ جاگ کر کون خط لکھا کرتے تھے؟ آزاد غزل کے قابلِ ذکر شعراء میں مظہر امام صاحب نے اپنے غالی مقتدی علیم صبا نویدی کا ذکر ہی نہیں کیا جس نے آزاد غزلوں کے مجموعے کی اولیت کا سہرا ''رد کفر'' کے طور پر اپنے سر باندھا لیا تھا۔ جاوید اختر چودھری کا 'حرام کا مال' پرچے کی حلت میں اضافہ کرتا ہے۔ ''ایک مکالمہ مدیر کے ساتھ'' مدلل ہے۔ اندر سنگھ ورما ہوں کہ انور شیخ، انہوں نے اقبال کی شخصیت کے منفی پہلو پر توجہ دی ہے۔ یوں بھی اقبال سب کو خوش رکھنے کے جتن کرتے تھے ؂

اُن سے اہل حدیث بھی خوش تھے
بدعتی اور خبیث بھی خوش تھے

ڈاکٹر منصور عمر کے تاریخی قطعات انہیں اس فن کا منصور بناتے ہیں۔ انور صدیقی کی وفات پر ''کہا ہاتف نے لکھو غنیض قاصد'' کہہ کروہ غنیض قاصد سے ۲۰۰۵ء برآمد کرتے ہیں مگر یہ لفظ غیظ ہے۔ کاش انور صدیقی کی حیات میں بھی ایک سو سال کا اضافہ ہو پاتا۔ (ظ) کے اعداد نو سو نکلتے ہیں۔

(رؤف خیر صاحب کا مراسلہ نظر نواز ہوا۔ تعجب ہے کہ وہ ''غنیظ'' اور ''غیض'' کے فرق کو نہ سمجھ سکے اور انتہائی خوبصورت انداز میں طنز کا وار کر دیا۔ ''غنیظ'' کے معنی سخت غصہ اور عتاب کے ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور ''غیض'' بکسر غین بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں '' کلی، شگوفہ، پانی کا کم ہونا، مجازاً تھوڑی بخشش، جنگل، کاغذ کی ارزانی وغیرہ ملاحظہ فرمائیں فرہنگ عامرہ، لغات کشوری، فردوس اللغات، جامع اللغات اور فیروز اللغات یا پھر قرآن مجید میں سورہ ہود کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے'' وَغِیضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ'' (ترجمہ: اور سکھا دیا گیا پانی اور ہو چکا کام) رؤف صاحب کو اعتراض کرنے سے پہلے کم از کم ڈکشنری تو دیکھ ہی لینا چاہئے تھا۔ منصور عمر) (خط کشیدہ جملے کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔ ادارہ)

❁ ڈاکٹر حنیف ترین (عرعر شمال): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ملا جو معنویت کے اعتبار سے بہت ہی اہم اور تاریخی ہے۔ آپ کی محنت اور ذہانت رنگ لا رہی ہے اور آپ کا پرچہ ہر اعتبار سے ہندو پاک کے نمبر ایک کے ادبی جرائد میں شمار ہوتا ہے جس میں ہر مکتبۂ فکر کے تخلیق کار موجود ہوتے ہیں۔

❁ فاروق راہب (موتی ہاری): ''تمثیل نو'' کے تازہ شمارہ ۱۷، ۱۸ میں اندر سنگھ ورما کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع تو ہے لیکن ذہن انتہائی محدود! اور اتنے وسیع المطالعہ شخص کی ذہنیت بالکل سکڑی اور سمٹی ہوئی دیکھ کر حیرت سے زیادہ افسوس ہوا۔ اقبال نے اپنے لئے ٹھیک ہی کہا تھا:

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

سید مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ''اچھا بابا'' کے سلسلے میں بھی ان کی سوچ کا دائرہ بہت ہی تنگ ہے۔ بیچارہ مصنف اپنی کہانی کی ہیروئن کے جسمانی ساخت میں جہاں تک نہیں پہنچ سکا، بھائی ورما نے تو شرم گاہ کے خول تک کی چھلانگ ماری۔ مظفر کی کہانی ''اچھا بابا'' ایک سلجھی ہوئی کہانی ہے۔ اسے ہندو یا مسلمان بن کر نہیں دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔ اچھا تو یہ ہوتا کہ وہ اس کے پلاٹ، Treatment یا کلائمکس کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرتے۔ افسانوں کے مینار، جمہوریت پسند، گاندھی وادی اور نہ جانے کتنے القاب سے نوازے گئے منشی پریم چند کی ہیروئن بھی تو مسلمان اور ہیرو ہندو ہوتا تھا۔ اس لئے پڑھے لکھوں (لکھے پڑھے نہیں) کی سوچ وفکر کشادہ ہونی چاہئے۔ ویسے بھی محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ ذات دھرم یا مذہب نہیں دیکھتی، صرف اپنے عاشق کو محسوس کرتی ہے۔ ہم اپنے اردگرد اکثر دیکھتے، سنتے اور اخبار میں پڑھتے ہیں کہ ہندو لڑکے کے ساتھ مسلم اور مسلم لڑکے کے ساتھ ہندو لڑکی گھر سے بھاگ گئی یا دونوں نے شادی کر لی۔ اسے لے کر کوئی فتنہ کھڑا کرتا ہے تو بیمار ذہن کا کیا علاج؟ یہ انداز و ادا تو جابر و قاہر سلاطین وقت سے بھی نہ رک سکا۔ لیکن فساد کے سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ مندر، مسجد یا قبرستان کی زمین کا تنازعہ یا کوئی مذہبی جلوس ہی فساد کی وجہ بنتا ہے۔

ہر ملک کا اپنا نظام اور قانون ہوتا ہے اور اس ملک کا شہری چاہے جہاں بھی ہو اس کے لئے اپنے ملک کے دستور کی پاسداری لازمی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے فلم نظر کی ہیروئن میرا اپنے ملک کی مجرم تو ہو ہی جاتی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں اس قسم کی پابندی نہیں ہے۔ ہماری عورتیں جہاں تک چاہیں اپنے جسم کی نمائش کر سکتی ہیں اور کرتی بھی ہیں۔ اپنی شرم گاہ اور پستانوں کو کم سے کم ڈھکنے کی انہیں کھلی چھوٹ ہے۔ کبھی کبھی تو یہ نام کا پردہ بھی غائب ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد

کے ریجنل سنٹرل دربھنگہ کے لئے آپ کو مستقل ریجنل ڈائرکٹر بنائے جانے پر مبارکباد قبول فرمائے۔ اس بار بھی مظفر کی کہانی ''خوش فہمی'' بہت عمدہ اور پیش کش شاندار ہے۔ اسے بھی مبارکباد۔

❁ شاذ رحمانی (کٹیہار): ''تمثیل نو'' اپریل تا ستمبر ۲۰۰۵ء کا مشترکہ شمارہ نظرنواز ہوا۔ سرورق پر تین مختلف معروف و ممتاز، گوناگوں اور عہد ساز شخصیتوں کی تصاویر بالترتیب شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ و مظہر امام شائع ہوئی ہیں جو نہایت دیدہ زیب و جاذب نظر ہیں۔ آپ نے ان مستند شاعر، ادیب، ناقد و محقق کے شایانِ شان قطعات بھی کہے ہیں جنہیں تصویر کے نیچے چسپاں کئے گئے ہیں ''مجھے کچھ کہنا ہے'' کے تحت بھی آپ نے ان نامور ادبی ہستیوں پر بتدریج تشفی بخش روشنی ڈالی ہے۔ ''وفیات'' کے باب میں آمر صدیقی مرحوم کو سرکاری ملازمت کے تعلق سے محکمہ تعلیم سہرسہ لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے پہلے وہیں ملازمت میں رہے ہوں لیکن میری دانست میں وہ تقریباً چار پانچ برسوں سے کٹیہار ضلع کلکٹریٹ (محکمہ فروغ انسانی وسائل) میں تھے۔ زیر نظر شمارہ جستہ جستہ دیکھ کر بھی اندازہ ہوا کہ بے حد معیاری اور ادبیت سے بھرپور جریدہ ہے۔ اسے مطالعہ میں رکھنا دنیائے ادب کی معلومات میں اضافہ کرنے کے مترادف ہوگا۔

❁ ڈاکٹر مسلم شہزاد (نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن): ''تمثیل نو'' کا تازہ ترین مشترکہ شمارہ (۱۷، ۱۸) ہمدست ہوا۔ یہ آپ کی بے پایاں کدوکاوش اور متحرک کارکردگی کا ثمرہ ہے کہ آج تمثیل نو کو ملک و بیرون کے معتبر اور معیاری جرائد میں شمار ہونے کا اعجاز حاصل ہے۔ آپ کا اداریہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ایک لامتناہی ادبی سلسلے کا اہم حصہ لگا۔ انداز بیاں اس قدر سلیس، سادہ اور پرکیف کہ قلم چوم لینے کو جی مچل اُٹھے۔ دیگر مشمولات میں پروفیسر سید منظر امام کی تخلیق 'دربھنگہ: دل سے جاتی ہی نہیں یاد تری' میں روپوش دربھنگہ کی ادبی اور تہذیبی فضا کا روح پرور منظرنامہ، سید مظفر شعیب ہاشمی کے قلم سے ابھری ہوئی کہانی ''خوش فہمی'' کا کلائمکس اور حقانی القاسمی کی تحریر ''گلوب پر پھیلتی ادب گلاب کی خوشبو'' سے معطر سابقہ تمثیل نو کا اجمالی خاکہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔

❁ رفیق شاہین (علی گڑھ): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ ۱۷، ۱۸ (اپریل تا ستمبر ۰۵ء) ہمدست ہوا۔ سرورق سے پھوٹتی رنگین شعاعوں کے درمیان سے جھانکتے تین ممتاز و مقتدر مشاہیر ادب کے دلکش و دلآویز چہرے جو کہ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور مظہر امام کے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہی تمثیل نو کے وقار و معیار کا بھرپور اندازہ ہو جاتا ہے۔ اپنے مشمولات کے حوالے سے بھی پرچہ وزن و وقار کا حامل ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر منصور عمر اور جمال اُویسی کے مضامین محنت سے تخلیق کئے گئے ہیں جو متاثر بھی کرتے ہیں۔ حقانی القاسمی بانکے اور نرالے نقاد ہیں ان کا انوکھا اسلوب Attract کرتا ہے وہ اپنے مضامین میں انگریزی اصطلاحات پیش کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ وہ بھی اپنے آپ میں انوکھی ہوں اور کسی کی سمجھ میں آسانی سے نہ آئیں اور وہ اس میں بھی Super دکھائی پڑیں۔ انہوں نے مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ''اچھا بابا'' کو نئے معانی و مفاہیم کا اشاریہ ثابت کیا ہے اور Sex پر Love کی فتح بھی قرار دیا ہے مگر یہ نہیں دیکھا کہ موقع و ماحول کی نزاکت کے خلاف کہانی کا اختتام جبریہ اور غیر فطری ہے۔ ہیروئن کی خود سپردگی کا محرک اس کی لفظیات میں مضمر تھا جس تک پہنچنے کی کہانی کار نے کوشش ہی نہیں کی جس کی وجہ سے کہانی کا اختتام Superfluous ہو گیا ہے اور Century آخری رن کی مات سے بنتے بنتے رہ گئی ہے۔ پروفیسر سید منظر امام کے گہرے تاثرات دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ کہانیوں میں جاوید اختر چودھری، سید مظفر شعیب ہاشمی اور نرگس جہاں کی کہانیاں، ''حرام کا مال''، ''خوش فہمی'' اور ''تہی داماں'' (بالترتیب) تینوں ہی متاثر کرنے والی مؤثر کہانیاں ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی حسب معمول معیاری اور پرکشش ہیں۔ پروفیسر نظیر صدیقی کے خطوط معلوماتی اور دلچسپ ہونے کے علاوہ ہمیں زندگی سے قربت کا احساس بھی دلاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں مرتب کرکے کتابی

شکل میں محفوظ کرلیا جائے۔ مراسلہ نگاروں میں پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برق کے مراسلے نے بیحد متاثر کیا ہے۔ موصوف کی عروض شاعری پر گرفت مضبوط ہے۔ ''ایک مکالمہ مدیر کے ساتھ'' مراسلہ نگار شری اندر سنگھ ورما (ہریانہ) نے اپنے مراسلے میں محض یہ نکتہ پیش کرنے کے لئے کہ ادب کی کہانی فلم کی کہانی اور ڈرامے میں ہندو مسلم کرداروں کو یکجا کرتے وقت یہ بھی دیکھنا لازمی ہے کہ کہانی کار کی یہ کوشش بجائے یکجہتی کے فرقہ وارانہ کشیدگی اور منافرت کا سبب تو نہیں بنے گی انہوں نے اشتعال میں آکر جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے اور مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ''اچھابابا'' کی ہندو ہیروئن کو لیکر وہ ایک مقام پر برہنہ ہو گئے ہیں۔ ساتھ ہی جذباتی ہو کر فحش کلامی کے مرتکب بھی ہوئے ہیں۔ انہیں اردو زبان پر تو قدرت حاصل ہے مگر خود پر اختیار نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ طریق کار کی برائی مقصد کی پاکیزگی کو ختم کر دیتی ہے۔ بات میں اثر تب ہی پیدا ہوتا ہے جب کہ بات کہنے کا ڈھنگ بھی اچھا ہو اور بات کہنے والا اپنے بلغمی جذبات کے بجائے صداقت اور معنویت کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ایک چھوٹی سی بات کہنے کے لئے جذباتی ہو کر آپے سے باہر ہو جانا اور عریاں ہو کر فحش گوئی کی حدود میں داخل ہو جانا افسوس ناک ہے۔ ورما جی نے ہندو ہیرو اور مسلم ہیروئن کو لیکر مسلمانوں کی نامعقولیت اور بدعقلی کا تو خوب ماتم کیا ہے مگر ذرا وہ خود اپنی جانب بھی نظر ڈالیں کہ کہانی کی ہندو ہیروئن کے غم میں وہ تہذیب وشائستگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں ایسے موضوعات کو چھیڑنے کے لئے خود ہر طرح کے تعصب سے پاک ہونا ضروری ہے۔

❁ سلطانہ مہر (یو۔کے): شمارہ ۱۷، ۱۸ ''تمثیل نو'' اپریل تا ستمبر ۲۰۰۵ء ملا۔ مذکورہ شمارہ ''تمثیل نو'' میں سید مظفر شعیب ہاشمی کا افسانہ خاصے کی چیز ہے۔ جناب اندر سنگھ ورما اور جناب حقانی القاسمی نے شمارہ ۱۵۔۱۶ کی تحریروں کا جائزہ دور بینی اور وسیع النظری سے کر کے ایک جامع مضمون کی شکل میں تبصرہ فرمایا ہے۔ راہ ورسم کا کالم دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

❁ اقبال حسن آزاد (مونگیر): ''تمثیل نو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ زیر نظر شمارہ ان معنوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ آپ نے اردو ادب کے رجحان ساز نظریوں کو یکجا کر دیا ہے اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ جہاں تک میری ناقص رائے ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارے نظریات ادب کے قاری کو الجھانے کیلئے پیدا کئے جاتے ہیں۔ اچھا ادب زبان ومکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ ولی دکنی سے لے کر میر، غالب، اقبال، فیض اور پریم چند سے لے کر عصمت چغتائی، منٹو، بیدی، انتظار حسین، اقبال مجید، عبد الصمد، حسین الحق، شفق، شوکت حیات اور شموئل احمد تک بے شمار ایسے شاعر وادیب سامنے آئے ہیں جن کی تخلیقات کو کسی سانچے میں رکھ کر پرکھنا غیر مناسب ہوگا۔ جاوید اختر چودھری کا افسانہ ''حرام کا مال'' کئی سطحوں پر متاثر کرتا ہے۔ حقانی القاسمی کی دونوں تحریریں پسند آئیں۔ ان کے یہاں جو بے ساختگی اور کھلا پن ہے وہ قاری کو اپنی جانب فوراً متوجہ کر لیتا ہے۔

❁ شاہ رشاد عثمانی (بھٹکل، کرناٹک): ''تمثیل نو'' کا نیا شمارہ موصول ہوا۔ اس بار آپ نے اُردو ادب کے تین رجحان ساز کو فوکس کیا ہے، تینوں کی آرا ایک ساتھ سامنے آگئیں، یہ آپ نے اچھا کیا۔

❁ فریدہ لاکھانی فرح (سڈنی، آسٹریلیا): آپ کا رسالہ اپریل تا ستمبر ۲۰۰۵ء ملا بے حد خوشی ہوئی۔ اس میں ایک مضمون ''نئے رجحان نئے تجربے'' پڑھنے کا اتفاق ہوا اور جنہوں نے لکھا ہے پھر اُن کے نام پر اُن کے Where about پر نظر گئی تو خیال آیا کہ جس طرح ہم یہاں رہ کر اُردو کا پودا اپنے خون سے سینچ رہے ہیں اسی طرح ڈاکٹر منصور عمر شعبۂ اُردو میں درس وتدریس کے ذریعے جن پودوں کی نشوونما کر رہے ہوں گے وہ قابل تحسین ہے اسی طرح یہ بھی قابل فخر اور افتخار کی بات ہے کہ آپ وہاں سے اُردو کا پرچہ 'تمثیل نو' نکال کر جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ بھی اسی ترقی پسندی خدمت کا قابل جو ہر نمونہ ہے۔

❁ عظیم ہاشمی (بتیا، مغربی چمپارن): 'تمثیل نو' نسیم اور مرزا کھونچ سے ہوتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا۔ مظفر شعیب ہاشمی کے ''اچھابابا''

پرا اندر سنگھ ورما کا تبصرہ اسی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگ سفید دھوتی کے اندر خاکی ہاف پینٹ پہننے کے عادی ہیں۔ 'نمرتا' کسی بھی قوم کی لڑکی ہو سکتی ہے اور کسی بھی ذات کی البتہ وہ مسلمان نہیں ہے اور آزادی کے بعد انڈیا میں ایسی کہانیوں اور فلموں کی تعداد زیادہ ہے جس میں ہیروئن مسلم ہے اور ہیرو کوئی اور لیکن یہ کبھی واویلا کی چیز نہیں بنی۔ ورما جی کا ذہن کچھ زیادہ شدت لئے ہوئے ہے ورنہ شعیب صاحب کی تحریر وہ جنسی احساس نہیں پیدا کر سکی جو خود ورما جی کے تبصرے نے کیا۔

❁ احتشام اختر (کوٹہ): اپریل تا ستمبر ۰۵ء کا ''تمثیل نو'' کا شمارہ ملا۔ رسالے کے سرورق پر شمس الرحمن فاروقی گوپی چند نارنگ اور مظہر امام کی تصاویر اپنے خوبصورت اشعار کے ساتھ شائع کی ہیں اور ان قد آور اور مقتدر شخصیتوں کو اردو ادب کے رجحان ساز لکھا ہے۔ بلاشبہ ان تینوں حضرات نے اُردو شعر و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور اب یہ ہمارے لئے زندہ لیجنڈ (Living Legend) بن گئے ہیں۔ آپ نے جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آزاد غزل پر ان حضرات کی گراں قدر آراء بھی شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر منصور عمر اور جمال اُویسی کے مضامین بھی توجہ طلب ہیں آپ کے تبصرے بے لاگ اور فکر انگیز ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے دربھنگہ ریجنل سنٹر کا ڈائرکٹر بنائے جانے پر میری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

❁ سیما عابدی (امریکہ): آج جیسے ہی Mail Box چیک کیا تو ''تمثیل نو'' دیکھ کر حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ آپ ایک خوبصورت ادبی پرچہ بڑی محنت کے ساتھ نکال رہے ہیں۔ لوگ اس کی تعریف یوں ہی نہیں کرتے!

❁ شاہد حسین لعل پوری (پٹنہ): ''تمثیل نو'' شمارہ ۱۸،۱۷ موصول ہوا۔ میرے انشائیہ ''میری قربانی'' پر تاثرات پڑھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ بطور خاص اس نے جناب پروفیسر شاہ طلحہ رضوی برق صاحب سے ''تجرباتی'' کی سند پائی۔

❁ صاحبہ شہر یار (جموں): ''تمثیل نو'' (اپریل تا ستمبر ۰۵ء) شمارہ موصول ہوا۔ اکیسویں صدی کی اُردو زبان و ادب کی حالتِ زار اور پھر 'تمثیل نو' جیسے رسالے کا متواتر چھپنا اور معیار کی برقراری کے لئے آپ کی پرخلوص کوششیں ہمارے دور کا سب سے اچھا جہاد بالقلم ہے۔ میری حقیر رائے یہ ہے کہ شعریات اور ادبیات کے علاوہ اُردو ورثے اور اُردو معاشرے کے احیائے نو کے لئے مختلف فارمیٹس وضع کئے جائیں تاکہ ایک گمشدہ وراثت اپنے متوالوں کی زیبائش آرائش کے لئے پھر جاگ اُٹھے۔

❁ ڈاکٹر قاسم فریدی (اورنگ آباد): ''تمثیل نو'' کا مشترکہ شمارہ ۱۸،۱۷ میرے پیش نظر ہے۔ یہ شمارہ بھی حسب روایت گذشتہ شماروں پر فوقیت لے گیا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس رسالے میں پہلی بار اُردو کے تین رجحان ساز ناقدوں کے ادبی نظریات سے استفادہ کرنے کا ہمیں موقع ملتا ہے۔ میرے خیال میں شاید پہلی بار کسی اُردو رسالے میں عہد موجودہ کی تین سربرآوردہ شخصیتیں بیک وقت اپنے ادبی نظریات کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ اس شمارے کے اعلیٰ درجے کے مضامین اور دیگر مشمولات نہ صرف یہ کہ قابل مطالعہ ہیں بلکہ دامن کش دل بھی ہیں۔ ''فکری اور عملی ڈسکورس'' میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے آزاد غزل کی فکری، حسیاتی اور ثقافتی عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ ''نئے رجحان نئے تقاضے'' ڈاکٹر منصور عمر کا ایک اچھا مضمون ہے۔ انہوں نے جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آزاد غزل کی فکری و فنی اور تاریخی حیثیت کا جائزہ لیا ہے۔ ابوذر ہاشمی نے تحریک، ایجاد اور ادب کی زندگی: منتشر خیالات'' میں ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت پر مختصر مگر کارآمد روشنی ڈالی ہے۔ حقانی القاسمی نے ''اس رنج بے خمار کی اب انتہا بھی ہو'' میں ایک نئی جستجو کا آغاز کیا ہے۔ ڈاکٹر گلشن کھنہ کا خاکہ ''ڈاکٹر دلدار ان آبادی'' دلچسپ بھی ہے اور مشاعروں کے لئے طنز بھی۔ پروفیسر سید منظر امام نے یادوں کی انجمن سجائی ہے۔ ان کی صاف

وشفاف نثر نے دل کی وادی کو آبشار بنادیا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ''ایک لہرنئی نئی'' میں ساختیاتی تنقید اوراس کے بنیاد گزاروں سے بحث کی ہے اوراس قبیل میں پروفیسر وہاب اشرفی کی کتاب ''مابعد جدیدیت مضمرات وممکنات'' پر استدلالی گفتگو کی ہے۔ اسرار اکبرآبادی کا مضمون معلومات افزا ہے۔ میمونہ بیگم نے ''پریم چند کی تخلیقات میں گاندھیائی نظریات کی نمائندگی'' میں ان کے نظریہ عدم تشدد کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے اور اپنی بات کو مصدق کرنے کے لئے اس قبیل کے افسانوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس شمارے میں تین کہانیاں موجود ہیں۔ جاوید اختر کی کہانی ''حرام کا مال'' ایک اچھی اور کامیاب کہانی ہے۔ 'خوش فہمی' سید مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ہے۔ ہاشمی کو کہانی بننے کا فن معلوم ہے۔ تاریخی تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے کہانی کے تاثر میں فرق نہ آنا، بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر نرگس جہاں کی کہانی ''تہی داماں'' شنو کے حرص وہوس کے تحت واقعی اس کو تہی داماں کرگئی۔ ایک عبرت آموز کہانی ہے اچھی لگی۔ اس شمارے کے مخصوص شاعر راز سیوانی کی غزلوں کا انداز شستہ اور پراثر ہے۔ ان کے کلام میں گداختگی ہے اور وہ سادہ وشگفتہ طرز بیان رکھتے ہیں۔ نظموں کا حصہ ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند، علقمہ شبلی، اسرار جامعی، ڈاکٹر انوری بیگم اور ڈاکٹر رضوانہ آرم نے متاثر کیا۔ ان کے یہاں فکروخیال کا ایک جہان آباد ہے۔ غزلوں کا حصہ کافی وقیع اور مقتدر ہے۔ سید امین اشرف، پروفیسر حامدی کاشمیری، ظفرکیفی، ڈاکٹر شمس مدنی، رئیس الدین رئیس اور سید مظفر شعیب ہاشمی کی غزلیں دل کو چھولیتی ہیں۔ اندر سنگھ ورما کا ''ایک مکالمہ مدیر کے ساتھ'' ان کے متعصبانہ ذہنیت کا اظہار ہے۔ اقبال کے سلسلے میں ان کا خیال متنازعہ فیہ ہے۔ اس سلسلے میں ماہرین اقبال ان کو جواب دیں گے۔ سید مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ''اچھابابا'' پران کی رائے بھی ان کی عصبیت ظاہر کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم کو بھگوا رنگ میں ڈبو کر اور ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی اعلیٰ ترین روایتوں کو بھلا کر لکھتے ہیں۔ اس کہانی پران کی تیکھی رائے ان کی بدنیتی کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ایک ادیب ہندو اور مسلمان نہیں ہوتا۔ وہ جب کچھ لکھتا ہے تو امن وشانتی بحال کرنے کے لئے لکھتا ہے اور پھر یہ بھی کہ کہانی یا کسی بھی فن کا کوئی بنا بنایا سانچا نہیں ہوتا۔ کہانی خود کو لکھواتی ہے۔ فنکار محض اس کے نقش ونگار ٹھیک کرتا ہے۔ کرداروں کے انتخاب میں وہ ذات پات یا دھرم و مذہب کے عمل سے نہیں گزرتا بلکہ خود بخود کردار پلاٹ سازی کے وقت اس کی جنبش قلم سے عالم وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔ کیا میں اندر سنگھ ورما سے پوچھ سکتا ہوں کہ ہاشمی کی کہانی میں تو کسی بھی مقام پر ایسی عریاں تصویر نظر نہیں آتی۔ پھر وہ اتنے چراغ پا کیوں ہیں؟ خود ان کی مذکورہ تحریر کیا ان کے فرقے کی عورت کا چیر ہرن کرتی نظر نہیں آتی؟ حقانی القاسمی نے ''گلوب پر پھیلتی ادب گلاب کی خوشبو'' میں ''تمثیل نو'' کی مقبولیت کا اعتراف کیا ہے اور ساتھ ہی سید مظفر شعیب ہاشمی کی کہانی ''اچھابابا'' کو بین تہذیبی مفاہمت کی وسیع تر کشادہ شاہراہ قرار دیا ہے۔ اس شمارے میں بارہ کتابوں پر جامع اور وقیع تبصرے موجود ہیں۔ یہ تبصرے مبصرین کی علمی استعداد کے شواہد پیش کرتے ہیں۔ ''نقوش علی نگر'' کی حیثیت ایک علیحدہ تبصرے کی ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم نے کتاب کی تمام کنیات پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی ''چھپنے سے چھپنے تک'' اور ''زندگی کا شاعر: امان خاں دل'' میں ڈاکٹر امام اعظم نے دونوں شعراء کی خلاقانہ بصیرتوں کو نمایاں کیا ہے۔

❁ راشد جمال فاروقی (دہرادون): ''تمثیل نو'' موصول ہورہا ہے۔ اس بار کے سرورق پر اردو ادب کے رجحان ساز کے تحت آپ نے فاروقی صاحب نارنگ صاحب اور مظہر امام صاحب کی بہترین تصاویر کے ساتھ اپنے شعری تاثرات دے کر پرچہ کو بالکل ابتدا ہی سے لائق دید اور لائق مطالعہ بنادیا ہے۔ فاروقی صاحب کا مقالہ جو اس شمارے میں شامل ہے شاید میں اسے 'شب خون' میں پڑھ چکا ہوں پھر بھی پڑھا اور محظوظ ہوا۔ سید مظفر شعیب ہاشمی صاحب کو میں صرف 'تمثیل نو' میں پڑھتا ہوں اور میرے

نزدیک موصوف فن افسانہ پر بھرپور گرفت رکھتے ہیں۔ پوری قدرت کے ساتھ کرداروں سے انصاف کرتے ہیں اور فن کی تمام ذمہ داریوں کا احساس بھی ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس بار کی کہانی بھی عمدہ ہے۔ اس شمارے میں ایک خط خاص ہے۔ میرا خیال ہے کہ بیشتر قارئین نے اندر سنگھ درماصاحب کے خط کو ضرور تجسس کے ساتھ پڑھا ہوگا۔ اقبال کے بارے میں ان کے جو کچھ بھی تاثرات ہیں ظاہر ہے انہیں حق ہے اس کے اظہار کا۔ اگر کسی کو ان کے خیالات سے اختلاف ہو تو دلائل کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ بحث بھی اگر چل نکلے تو بُرا نہیں ہوگا۔ میرے لئے اس خط میں جو بات باعث تشویش ہے وہ یہ کہ "اچھا بابا" پر تبصرہ کرتے ہوئے مراسلہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ "مسلم افسانہ نگار کا خاصہ بن چکا ہے کہ افسانے کے نقطۂ عروج تک پہنچتے تک ہندو عورت کے جسمانی نشیب وفراز اس کے عریاں جسم اور اس کی کھلی ٹانگوں کے بیچ سے جھانکتی اس کی شرم گاہ میں دخول کے تصور سے ذہنی جلق لگا کر تلذذ حاصل کرلیتا ہے۔" اگر واقعی مسلم افسانہ نگار اپنے افسانوں میں نسوانی کرداروں کو اسی نیت سے مسلم مرد کرداروں کے ہمراہ پیش کرتے ہیں تو میری آواز درماصاحب کی حمایت میں اُٹھے گی۔ اردو کے مسلم افسانہ نگار حضرات اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیں تو 'تمثیل نو' کے صفحات انہیں دیجئے۔ 'نیا ورق' ممبئی کے تازہ شمارے میں جتندر بلو کی کہانی 'تعلق' سے لطف اندوز ہو لینے کے بعد مجھے اچانک درماصاحب کا مراسلہ یاد آگیا اور میں سوچنے لگا کہ جتندر بلو نے مسلمہ (مسلم عورت) اور افسانے کے غیر مسلم ہیرو کو بھی کہیں اسی نیت سے تو نہیں خلق کیا ہوگا۔ لیکن ایک عمدہ افسانے کو میں نے پھر اس معمولی سی بات کے لئے گم تبصر نہیں دیئے۔ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جیسے سادہ لوح لوگ نہیں سمجھتے ہوں اور واقعی بھائی لوگ اپنے فرقہ وارانہ جذبات کی تسکین کے لئے یہی سب کچھ دانستہ طور پر کررہے ہوں۔

❁ تفضیل احمد (موتیہاری): "تمثیل نو" کا شمارہ موصول ہوا۔ اس رجحان ساز شمارے کو تاریخ ساز شخصیات کی ایک جھلک کہنا زیادہ مناسب ہے، جس کی ترجمانی حقانی القاسمی کے مضامین سے بھی ہورہی ہے۔ اسرار اکبرآبادی کا مذہبی صداقتوں کی نشاندہی کا سلسلہ اور کتابوں پر تبصرے، بہت خوب ہیں۔

❁ احمد فرمان (واسعپور، دھنباد): تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر اُردو ادب کے رجحان ساز معزز، معتبر اور معروف شخصیات شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، مظہر امام کی تصویریں اُن کے نیچے نام پھر ان کے نیچے انہیں شخصیات کے مناسبت سے قطعات کیا ہی لاجواب ہیں۔ اداریہ میں تینوں شخصیات کے ادبی وشعری نظریات کی تھوڑی سی روشنی ڈالی گئی ہے۔ وہ بالکل صحیح ہے اور پھر تینوں اہم شخصیات کے مضامین مزید معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ بھی مشمولات معیاری و لائق مطالعہ ہیں۔ خصوصاً منظر شہاب، سید امین اشرف، پروفیسر حامدی کاشمیری کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ رشیدہ عیاں (امریکہ) کی نظم عشق اور ڈاکٹر انوری بیگم کی نظم 'بار بہاری' دونوں اچھی ہیں۔ استاد محترم جناب سید منظر امام صاحب کا بالکل بے باکانہ انداز میں تاثرات پیش کرنا اپنے وطن دربھنگہ کے شب و روز کی یادیں یقیناً کسی کے بھی بچپن اور جوانی کی یادیں تازہ کردیتی ہیں۔

❁ غلام مصطفیٰ روحی کٹیہاروی (کٹیہار): "تمثیل نو" کا تازہ شمارہ (۱۷،۱۸) موصول ہوا۔ رسالہ دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھا۔ پرچہ کی طباعت اور ترتیب بہت حسین اور جاذب نظر ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ علم وآگہی اور فکر وفن کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ جس کے تمام مضامین آپ کے اداریہ "مجھے کچھ کہنا ہے" سے لے کر "راہ و رسم" تک پھولوں کی طرح اپنی بہار دکھلانے اور خوشبو لٹانے میں مصروف ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا "تمثیل نو" کو آسمان ادب وفکر کا وہ مہر درخشاں بنائے جس کی تابانی پوری دنیا کو محیط ہو۔

❁ سید ہاشم رضا (بتیا، مغربی چمپارن): "تمثیل نو" کا تازہ شمارہ اپریل تا دسمبر ۰۵ء ملا۔ شمارہ حسب توقع معیاری

ہے۔ شروع سے اخیر تک دلچسپی قائم ہے۔ اندر سنگھ ورما کا مکالمہ پڑھ کر افسوس ہوا کہ ایسا ادیب اس طرح کے خیالات رکھتا ہے اور ایسی گندی زبان استعمال کرتا ہے۔ پہلے تو انہوں نے علامہ اقبال ایسی شخصیت کو متنازعہ بنایا پھر مظفر شعیب ہاشمی کے افسانہ ''اچھا بابا'' کو لیکر مسلمانوں کی کردار کشی کردی۔ افسانہ افسانہ ہے اس میں ہر طرح کے کردار ہوتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان کا سوال اٹھانا وہ بھی نہایت گندے الفاظ اور خیالات کے ساتھ، قابل مذمت ہے۔

❀ فیاض احمد وجیہہ (عدلپور، دربھنگہ): ''تمثیل نو'' کے اس شمارے میں جدیدیت، مابعد جدیدیت اور آزاد غزل کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور مظہر امام کے نظریاتی افکار کا امتزاج اپنے تمام پہلو میں ڈاکٹر منصور عمر، جمال اُویسی اور حقانی القاسمی کے فکر امروز خیال (مباحث) کے باعث بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پیچیدہ اور ژولیدہ نثر سے ماورا یہ دستاویز تمثیلی قاریوں کے لئے نہ صرف حسین اور دلکش تحفہ ہے بلکہ اُردو عالمی گاؤں میں پہلا اور کامیاب تجربہ بھی۔ مدیر ''تمثیل نو'' نے تخلیقی تجربہ تھیوری اور صورت حال پر نظریاتی بحث دے کر رجحان سازی اور تخلیقی تجربہ کے مابین امتیازی اوصاف تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ بیک لفظ زیر نظر شمارہ قاری کے منفرد مزاج کا پارکھ ثابت ہو رہا ہے۔ دربھنگہ کسی دبستان سے کم نہیں ہے یہاں ایسے ایسے جیالے ہیں جو بعض معاملوں میں اردو ادب کا سرنامہ قرار دئے جاسکتے ہیں۔ مکالمے کے طور پر اندر سنگھ ورما کا مکتوب بلاشبہ خاصا پڑھا لکھا ہے اور مدیر کی دیانت داری کا بین ثبوت بھی۔ اقبال پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے خود ساختہ سیاسی افکار کو موضوع بنایا ہے اور 'اچھا بابا' میں مذہبی افکار (ذہنی اپج کو)۔ اس تضاد بیانی میں وہ اپنی سیکولر ذہنیت کا پروپیگنڈہ کرتے نظر آرہے ہیں۔ دراصل شاعر اقبال، مفکر اقبال اور مسلمان اقبال کو الگ الگ تلاش کرنے میں بہتیرے اشکال پیدا کر لئے گئے ہیں جس سیاسی خطبے میں انہوں نے پاکستان کا تخیل پیش کیا تھا اس میں انہوں نے تھیا کریسی (Theocracy) کی سختی سے نفی بھی کی تھی۔ اب ورما جی چاہیں تو اس سے بھی اپنا مفروضہ مستحکم کر سکتے ہیں۔ رام، گوتم، نانک، وشوامتر کے ترانے گانے والا اقبال خود اقبال کو سمجھ میں نہیں آیا۔ خیر ورما جی کو چند چیدہ چیدہ اقتباس میسر آئے اور انہوں نے قادیانی اقبال بھی برآمد کرلیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال قادیانی ہو یا نہ ہو لیکن ہندو تو ثابت کیا ہی جاسکتا۔ کہیں آپ کا کچھ ایسا ہی ارادہ تو نہیں ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اقبال سچا ہندوستانی مسلمان تھا ورنہ اس کو یہاں کا ہر ذرہ دیوتا نظر کیوں آتا اور جہاں تک اچھا بابا کی بات ہے تو جاننا چاہئے کہ افسانے کی محدود قرأت سے ناگفتہ بھی انسان کی ذہنی اپج میں شامل ہو کر مطالب و مفاہیم برآمد کر لیتا ہے۔ نمرتا ہندو طبقے کی عورت ہے اس لئے کہانی کار بھٹک گیا۔ ورما جی مان لیجئے کے نمرتا زرینہ ہے۔ پھر تو مذہبی طور پر افسانہ نگار کی اور گرفت ہونی چاہئے اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایسے فکشن نگاروں پر فتویٰ صادر کر دینا چاہئے۔ دراصل ورما جی افسانے کے آس پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ چوں کہ جب نمرتا کہتی ہے کہ اچھا بابا تم جیت گئے تو اسلامی نقطۂ نظر سے افسانہ نا تمام ہے۔ قاعدے سے تو اس کو کلمہ بھی پڑھنا چاہئے خیال رہے افسانے میں مسلمان بننے کی دعوت جس طور پر دی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی نفسیات کو پرکھنا چاہتا ہے اور محبت میں تبلیغ ہو بھی نہیں سکتی۔ یہاں فکشن نگار جدید انسان کے محبت کی گاتھا بیان کر رہا ہے مذہب تو اس کے لاشعور میں بھی نہیں ہے۔ بوس و کنار کا بھی خاص پہلو ہے۔ ' ربھنگہ دل سے جاتی ہی نہیں یادتری' میں تخلیقی نثر کا عنصر نمایاں ہے۔

حضرت قاضی مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی سرزمین جالے کے ان کے عزیز معروف سماجی شخصیت

جناب سعید عالم

(العالم ٹریڈ سنٹر ممبئی)

محتاج تعارف نہیں۔ آپ بے لوث فلاحی کاموں کے لئے ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ اپنی خدمات کے ذریعے وہ ملی مسائل سے ہمیشہ باخبر رہتے ہیں اور انسانیت پر جب بھی کوئی افتاد آپڑتی ہے تو اس کے سدباب کے لئے آپ دامے درمے قدمے سخنے مستعد اور چاق وچوبند رہتے ہیں۔ سال ۱۹۹۵ء۔ ۱۹۹۶ء میں ریاست بہار کے مختلف اضلاع میں پھیلی کالا آزاد کی بیماری کو لے کر انہوں نے مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے تعاون سے کیمپ لگا کر خدمت خلق کی چیدہ مثال پیش کی۔ العالم ٹریڈ سنٹر (ممبئی) کا ایک بڑا اور دیرینہ خواب قصبہ جالے میں حمزہ میموریل اسپتال کی تعمیر ہے۔ اس کا خاکہ بھی تیار ہے۔

سعید عالم کو ان کی بے لوث خدمات کے لئے ۱۹۹۹ء میں مرکزی وزیر کابینہ اور کرناٹک بھاجپائی صدر پنکا رودت رائے کے ہاتھوں "بھارت نرمان اکسیلنٹ ایوارڈ" اور اسی سال دہلی میں آسام اور منی پور کے گورنر ڈاکٹر بھیشم نرائن سنگھ اور سابق گورنر ستیہ نرائن ریڈی کے مبارک ہاتھوں "بھارت جیوتی ایوارڈ" سے بھی نوازا گیا۔ ان کے علاوہ لوک سبھا کے نائب صدر شری پی ایم سعید اور انفارمیشن براڈ کاسٹنگ کے ریاستی وزیر جناب مختار عباس نقوی کے ہاتھوں "اچیور آف ملینیم ایوارڈ" بھی دیا گیا۔ موصوف ہر سال نادار اور مفلسوں کے درمیان کمبل وغیرہ بھی تقسیم کرتے ہیں۔ ان بے لوث خدمات کے لئے انہیں نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلے کی پرواہ ہے۔

خدا ان کی خدمات قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا کرے۔

ادارہ "تمثیل نو" آپ کی خدمات کا معترف ہے!

BIHURD00640/04/1/2005-TC
Monthly **Tamseel-e-Nau**
Vol. : 5, Issue : 19
Editor : **Dr. Imam Azam**
Quilaghat, Darbhanga - 846004 (Bihar)
Rs. 20/-
October-December - 2005
Tel. : 06272-258755
Cell : 9431085816
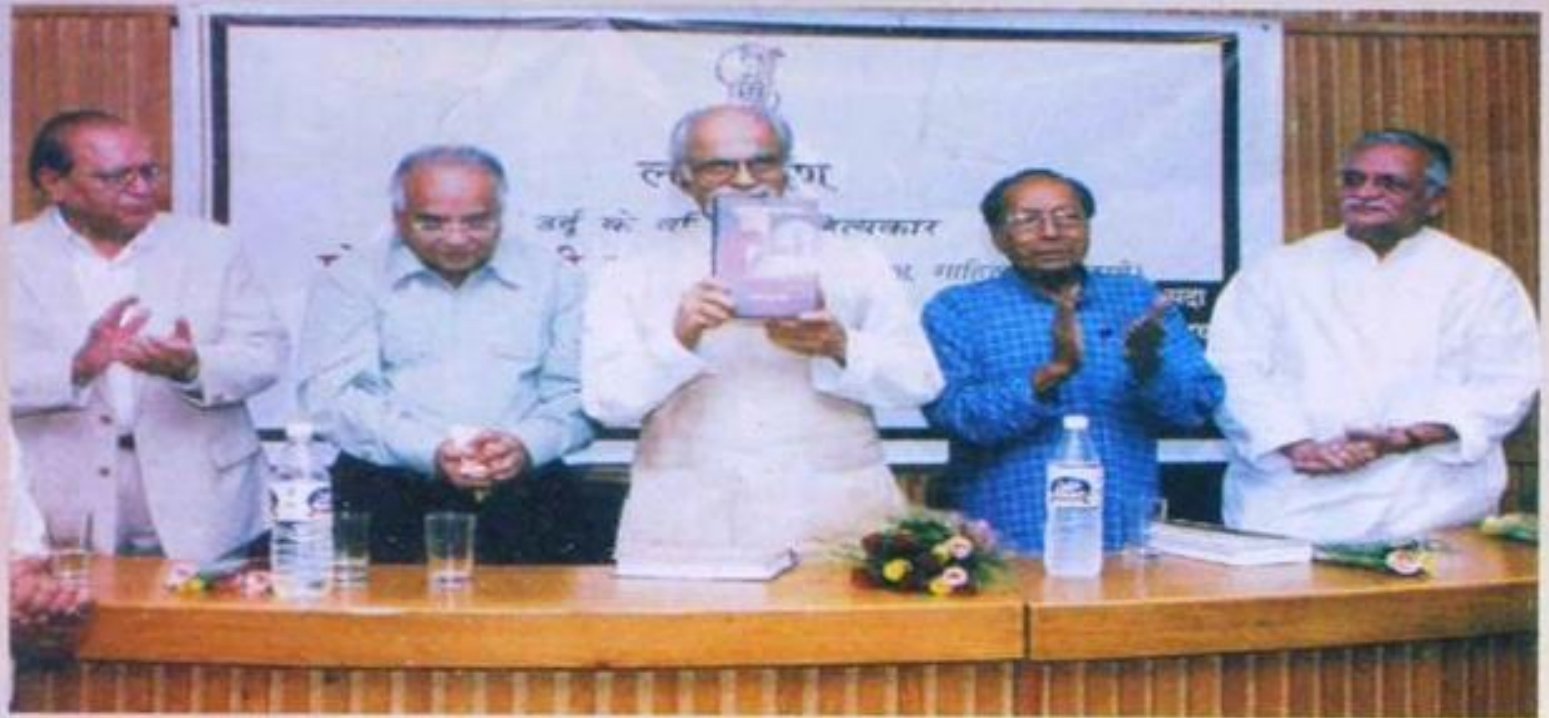
جناب اندر کمار گجرال سابق وزیر اعظم ہند، پروفیسر گوپی نارنگ کی تازہ ضخیم ہندی کتاب 'اردو پر کھلتا دریچہ' کی رسمِ اجرا انجام دیتے ہوئے۔
تصویر میں نارنگ صاحب کے علاوہ پروفیسر مشیر الحسن، کملیشور اور گلزار کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔
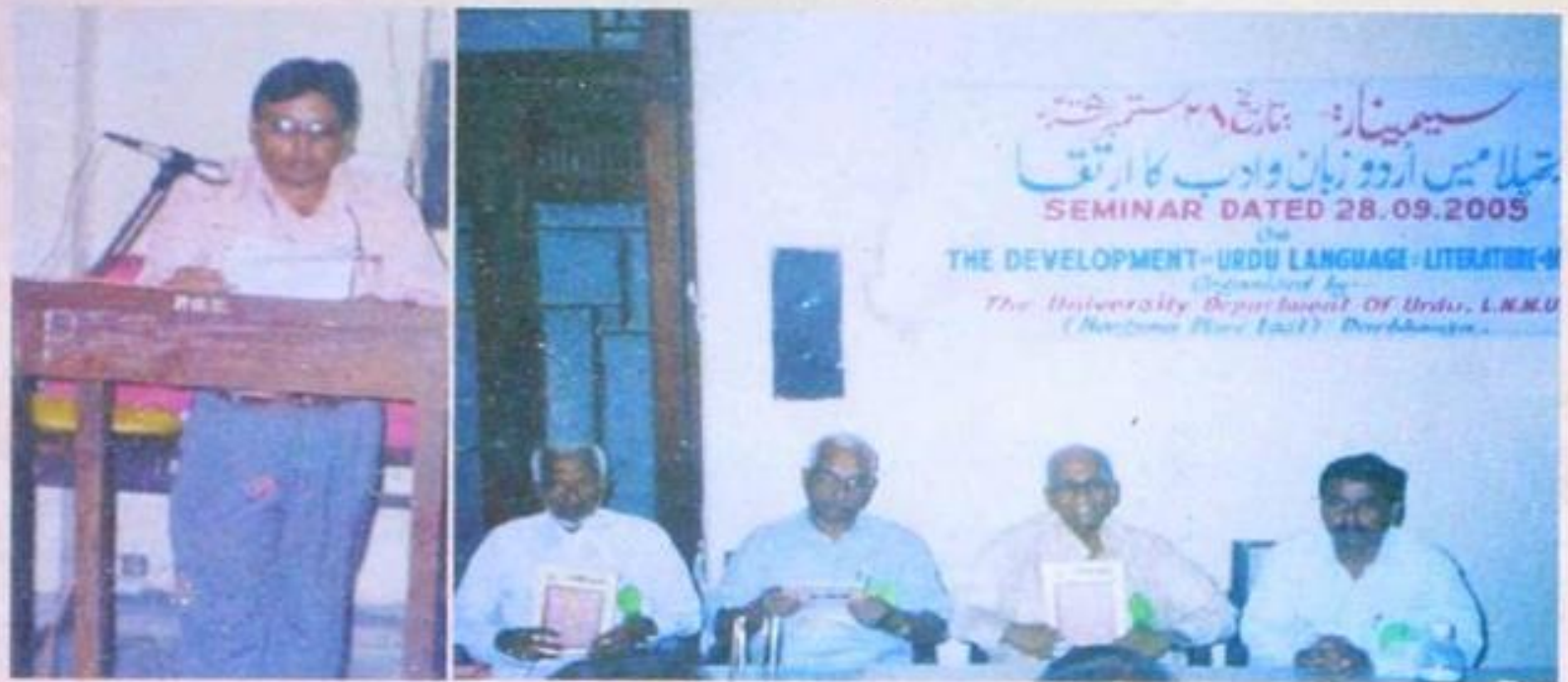
دائیں سے بائیں: ڈاکٹر عبدالواحد، ڈاکٹر نیلامبر چودھری (ایم ایل سی)، پروفیسر آر پی سنہا (وائس چانسلر)،
پروفیسر محمد طیب صدیقی (صدر شعبۂ اُردو) اور مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر امام اعظم۔

چیئرمین سینٹ آف پاکستان محمد میاں سومرو (داڑھی والے)، چیئرمین بورڈ آف چرچ اینڈ سوسائٹی ریورنڈ ڈاکٹر افضال فردوس